صحیفہ

غالب نمبر

اکتوبر ۱۹۶۹

مرتب
ڈاکٹر وحید قریشی

اُنچاسواں شمارہ
اکتوبر ، ۱۹۶۹ع

صحیفہ

غالب نمبر

(حصہ چہارم)

مدیر اعزازی : ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر معاون : کلب علی خاں فائق

محکمۂ تعلیم مغربی پاکستان نے جملہ مدارس کے لیے بذریعہ
سرکلر جی/۲۲۹۲۹ منظور کیا
افواج پاکستان کی یونٹ لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ناظم : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
مجلس ترقی ادب ، ۲- کلب روڈ ، لاہور
ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
طابع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

سالانہ چندہ : روپے
فی پرچہ :

فہرست مضامین

مشفق خواجہ :

غالب اور صفیر بلگرامی (دوسری اور آخری قسط) - - - - - ۱ تا ۲۹

ڈاکٹر فرمان فتح پوری :

غالب اور غالب تخلص کے اُردو شعرا - - - - - - - ۳۱ تا ۵۷

سعادت علی صدیقی :

یادگار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری میں غالب کے بعض اشعار - ۵۸ تا ۶۵

ڈاکٹر گیان چند :

غالب کے نقاد - - - - - - - - - - - ۶۶ تا ۷۸

فتح محمد ملک :

غالب اور ہمارا قومی شعور - - - - - - - - ۷۹ تا ۸۳

میرزا ادیب :

غالب کا ذہنی وطن - - - - - - - - - - ۸۴ تا ۹۱

ڈاکٹر محمد باقر :

غالب کا سیاسی ماحول - - - - - - - - - ۹۲ تا ۹۸

عشرت رحمانی :

غالب کی ادا شناسی اور نوا سنجی - - - - - - ۹۹ تا ۱۰۲

ڈاکٹر عابد رضا بیدار :

غالب کی تفہیم - - - - - - - - - - - ۱۰۳ تا ۱۰۶

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی :

غالب کے دو شاگردوں کے متعلق دو سوال - - - - - ۱۰۷ تا ۱۱۰

ڈاکٹر لئیق بابری :

غالب کے پانچ اشعار (فرانسیسی میں ترجمہ) - - - - - ۱۱۱ تا ۱۱۲

ایم اسلم :
غالب کے اشعار پر نثری تضمین - - - - - - - - - - ۱۱۳ تا ۱۱۵
سید امتیاز علی تاج :
غالب اور اُن کی بیگم (دیوان غالب میں سے ایک شعری مکالمہ) ۱۱۶ تا ۱۲۲
رفتار ادب
مجلس ترقی ادب کی کارگزاری
اشتہارات

مشفق خواجہ

غالب اور صفیر بلگرامی

(دوسری اور آخری قسط)

غالب سے ملاقات کا حال صفیر نے تفصیل کے ساتھ ''جلوۂ خضر'' جلد اول کے جلوۂ پنجم میں (صفحات ۲۲۸-۲۱۸) بیان کیا ہے۔ صفیر نے غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

غالب علیہ الرحمہ:

''اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ، اکبر آبادی مولداً، دہلی مسکن، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ۔ یہ وہ خوش مذاق شخص گزرا ہے جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا کیا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولایتی فارسی کا یقین چار شخصوں کے کلام پر ہوا؛ اول امیر خسرو، دوم حسن دہلوی، سوم مرزا بیدل، چہارم غالب۔ اگرچہ ناصر علی سرہندی اور مرزا جانجاناں مظہر اور غنی کشمیری اور غنیمت اور خان آرزو اور آزاد بلگرامی اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فریاد، یہ سب کے سب خوش گو اور شاعر بے بدل تھے مگر جامہ ایجاد جو خدا داد ہے، انھیں چاروں کے راست قامت پر راست آیا۔ اور ان چاروں کے سوا جن کے نام نامی لکھے گئے ہیں، ان پر بھی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا۔ گو ان کے سوا اور بھی شعرائے فارسی ہندوستان میں ہوئے ہیں مگر ان لوگوں کی خوبیوں کو نہیں پاتے۔ اور یہ لوگ ان چاروں کی شہرت ایجاد نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔

''اہل مذاق با انصاف میرے اس لکھنے کا برا نہ مانیں۔ میرا خاندان سلسلہ وار صاحب علم و شاعر گزرا ہے۔ سید خورشید علی خورشید تخلص میرے پردادا کے والد اور سید بندہ علی بندہ میرے پردادا۔ سید غلام یحییٰ یحییٰ تخلص میرے دادا۔ حضرت صاحب عالم میرے نانا۔ یہ سب کے سب فارسی کہنے والے اور بڑے بلند خیال تھے۔ اسی طرح بلگرام میں بہت شعرائے فارسی اپنا ڈنکا

بجا گئے ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ میں نے علامہ عبدالجلیل بلگرامی کو بھی کہ نعمت خاں عالی کے ہم عصر اور ہم طرح وقائع میں تھے ، شمار نہیں کیا کیونکہ یہ لوگ اور پایہ رکھتے تھے ۔ غرض میرے نزدیک آغاز امیر خسرو سے ہوا اور انجام غالب دہلوی پر ہوا ۔ ہندوستان کی فارسی کا کہ شمس‌الدین فقیر دہلوی کے وقت سے ایک طرز خاص سلاست آمیز شروع ہوا تھا ، رنگ ہی بدل دیا اور بڑی ہمت کر کے فارسی کو پھر ولایت کی کرسی پر بٹھایا ، ان کے کلام سے ظاہر ہے ۔ اردو نظم بھی ایک طور خاص کی کہی ، اس میں بھی ایجاد خاص ہے ۔ آخر میر تقی کا رنگ بالکل اتار لیا ۔ اوائل میں حضرت نے ناسخ کی ایجاد پر توجہ فرمائی اور فارسی گوئی کی عادت سے اس کو بلند کر دیا ، یعنی نہ ناسخ کی طرز رہی اور نہ دہلی کی ۔ دقت پسندی کے ساتھ ترکیب و بندش فارسی زیادہ کر دی ، یہاں تک کہ سوائے فعل کے کوئی لفظ ہندی اکثر شعروں میں نہیں آیا ۔ مثلاً :

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اس میں ''آیا'' کی جگہ ''آمد'' اور ''مانگے'' کی جگہ ''طلبد'' بنا دو تو فارسی کا مطلع اور شعر ہے ۔ اسی پر حضرت نے فرمایا ہے :

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

مگر جب دقیقہ سنجوں نے حضرت کے اشعار کو بے‌معنی کہنا شروع کیا تو حضرت نے فرمایا :

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اس پر بھی لوگوں نے اکتفا نہ کی اور زبانی حضرت سے کہا کہ آپ مشکل پسندی کو چھوڑ دیجیے ۔ چنانچہ اس کا ذکر جناب آزاد نے آب حیات میں کیا ہے ۔ اس وقت حضرت نے یہ رباعی کہی ۔ رباعی :

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن وران کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

آخر اپنے دیوان کو منتخب فرمایا اور کوئی بیس جزو کا چار جزو پر دار و مدار رکھا اور یہ شعر فرمایا :

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یعنی حضرت کا مذاقِ خاص اس انتخاب سے معلوم ہو گیا ۔ واقعی انتخاب وہ کیا کہ اب اس سے زیادہ انتخاب نہیں ہو سکتا اور اس انتخاب کے بعد سے میر تقی میر کے طرز کو اختیار کیا اور آغاز اس کا اس شعر سے کیا :

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ[1]
آپ بےبہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اس پر ذوق نے طعن سے کہا بھی :

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مگر حقیقت ہیں میر کا انداز جو کچھ برتا تو غالب ہی نے برتا ۔ اگرچہ میر تقی کی زبان کی مناسبت تو نہیں ہے کیونکہ ان کے وقت میں زبان بہت کچھ صاف ہو چکی تھی ، مگر بندش اور الفاظ کی چستی اور درستی بالکل میر کی ہے ، مگر کبھی میر سے انحراف نہ کیا ۔ شوخیِ طبع سے اگر کہا بھی تو یوں کہا :

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذوق کو ان سے کچھ مناسبت نہیں تھی ۔ چنانچہ فارسی کے دیوان میں قطعات حضرت غالب کے اسی غیر مناسبت کی دلیل ہیں اور جناب آزاد نے بھی آب حیات میں اس کا اشارہ کیا ہے ۔ اردو نثر میں پوری واقعہ نگاری کا ایجاد انہیں کا ہے ، ورنہ اس سے پہلے مرصع اور مسجع غیر واقع نثر لکھی جاتی تھی ۔ اردوے معلیٰ انہیں جواہر بھرے خطوط کا مخزن ہے جس میں اس نئے ایجاد کا رنگ ہے ۔ بعد طبع اردوے معلیٰ چودھری عبدالغفور صاحب سرور مارہروی نے کہ حضرت غالب کے شاگرد تھے اور مرید حضرت صاحب عالم صاحب مولف کے نانا کے تھے ، وہ خطوط اردو حضرت غالب کے جو ان کے نام اور جناب نانا صاحب کے نام اور لوگوں کے نام آئے تھے ، جمع کر کے اس کا نام ''عود ہندی'' رکھا ۔ جن دنوں میں حضرت غالب کی ملازمت کو مارہرہ ہو کر دہلی گیا تھا ، وہ انشا

---

۱ ۔ کذا ۔

مرتب ہو رہی تھی - چنانچہ اس مسودے کی نقل میں اپنے ساتھ بھی لایا تھا - اب تو وہ کتاب چھپ گئی مگر میرے نام کے خطوط چونکہ بعد اس کے میرے پاس آرہ اور پٹنہ میں آئے تھے ، وہ اس ترتیب میں داخل ہونے سے رہ گئے -[1] مگر ایک تقریظ رسالہ ''رشحات صفیر'' المشہور بہ ''فیض صفیر'' تانیث تذکیر کی اس میں چھپی ہے - تشریح اس نثر اردو کی ان شاء اللہ تعالی تذکرۂ نثر اردو میں کی جائے گی -

''حضرت غالب کا حال کمال شہرت سے محتاج بیان نہیں اور جناب آزاد نے ''آب حیات'' میں بہت مشرح مع لطائف کے سب کچھ لکھا ہے - مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی مختصر کیفیت اپنی ملازمت اور شاگردی کی یہاں لکھ دوں - وہ بھی لطائف سے خالی نہیں -

مولف کا دھلی جانا اور حضرت غالب سے شاگردی کا خلعت پانا

'' ۱۲۸۰ ہجری میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا اور بعد شادی کے اپنے نانا حضرت صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا - رستے میں فرخ آباد پڑا ، وہاں جناب ڈپٹی کلب حسین خاں بہادر نادر سے ملاقات کا[2] لطف اٹھایا - جب مارہرہ پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیضیاب ہوا ، وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا - نانا صاحب سے اور ان سے ایک ربط خاص تھا مگر لطف یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی - میں نے خواہش کی کہ حضرت غالب کا شاگرد

۱- یہ درست نہیں ہے - صفیر کے نام تمام خطوط ۱۲۸۱ ہجری تک کے ہیں - ان کا غالب کے کسی مجموعے میں شریک نہ ہونا تعجب خیز ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ یہ خطوط مرتب ہو رہے تھے تو صفیر دہلی میں تھے - صفیر کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ ''اردوے معلیٰ'' پہلے چھپی اور ''عود ہندی'' بعد میں - ''عود ہندی'' ۱۰ رجب ۱۲۸۵ ہجری (مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ع) کو شائع ہوئی اور ''اردوے معلی'' ۶ مارچ ۱۸۶۹ع (مطابق ۲۱ ذیقعدہ ، ۱۲۸۵ ہجری) کو شائع ہوئی - صفیر نے سرور کو عود ہندی کا مرتّب قرار دیا ہے ، یہ بھی درست نہیں - ''عود ہندی'' کی پہلی فصل سرور کی مرتبہ ہے ، جس کا نام ''مہر غالب'' ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں صفیر نے متعلقہ کتابوں کو پیش نظر رکھے بغیر حافظے سے لکھی ہیں -
۲- اصل : ''کی'' جو سہو کتابت ہے -

ہوں اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا ۔ حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد مثنوی ابر گھر بار کی اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا ۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بہ فرمائش تفضل حسین خاں (جنھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) مارہرے میں کہا تھا ۔ اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیج کر بلگرام آیا اور وہاں سے آرے پہنچا ۔ حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا ۔ جب میں نے "بوستان خیال" کو اردو کر کے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا ، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس پٹنہ میں بھیجا ، میں نے ایک جلد بھیج دی ، اس وقت سے خط و کتابت رہی ۔ یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ ہجری میں بے اختیار مجھے آرے سے دہلی جلنے کی تحریک کی اور بے شان گمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانہ ٔ دہلی ہوا ۔ آموں کا موسم تھا ، نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیے ۔ میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا ۔ دس بجے شب کو دہلی پہنچا ۔ شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی ، صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ ٔ بلی ماراں میں حضرت غالب کے پاس پہنچا ۔ حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے ۔ ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے ، دیکھ کر بشاش ہوگئے ۔ اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا ، پوچھا یہ کون ہیں ؟ میں نے عرض کی صفیر ؟ ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا ۔ بولے ذرا ٹھہر جائیے ۔ یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے اور بغل گیر ہوئے اور برآمدے سے اندر آ کر بیٹھے ، گرمی کے دن تھے ، صفر کا مہینہ تھا ۔

"حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا : پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا کلی دار ، لیفہ سرخ ٹول کا ، بدن میں مرزائی ، سر کھلا ہوا ، رنگ سرخ سفید ، منہ پر داڑھی دو انگل کی ، آنکھیں بڑی ، کان بڑے ، قد لمبا ، ولایتی صورت ۔ پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی ۔ آنکھوں میں سوز موجود تھا ۔ کان کی سماعت میں کچھ ثقل آ چلا تھا ۔

۱- صفیر یہ تذکرہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس کی نوبت نہ آئی ۔

''الغرض اندر آ کر بیٹھے - بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں - اتنے میں نواب ضیاء الدین خاں بھی تشریف لائے ، حضرت نے مجھے ان سے ملایا - وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے ، کرتا پہنے ، خلطہ دار پاجامہ ، سر پر ٹوپی ، جریب ہاتھ میں - بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرہے تھے آئے ہیں - اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی - جب وہ اُٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اٹھے اور مجھے اور میرے ماموں صاحب کو اپنا تمام مکان دکھایا - ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے ہے اور یہ فلاں کام کے واسطے - آخر زینے کے پاس آئے اور چھت پر چلے - ہم لوگ بھی ساتھ تھے - اوپر کو جا کر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرہ گلی کے رخ بنا ہوا تھا -

لطیفہ :

''فرمایا میں بلامبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے - یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے ؟ میں نے کہا سمجھا ، یعنی گرمی کے دن ہیں ، دہلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے - الغرض پھر کوٹھے کے نیچے آئے اور فرمایا اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں - اس لیے ضیاء الدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے ، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے - گو تھوڑا سا دور ہے مگر آرام بہت ملے گا - میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے ، فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے - یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور میرے ساتھ کیا - ہم لوگ اُس مکان میں پہنچے- وہ مکان عالی شان تھا ، ایک بڑا پھاٹک بر سر سڑک جس پر ایک بنگلہ خوشنما بنا ہوا ، اس کے اندر ایک خالہ باغ تر و تازہ ، اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ سجا سجایا ، اس کی پشت پر محل سرا ، دونوں بغلوں میں کمرے ، غرض بہت خوش آب و ہوا مکان ملا - ہم لوگ سب چھ آدمی تھے ، اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے - الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوشنما پڑے تھے ، انہیں رفیق کے ساتھ آئے - معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوشبو تخمی آم تھے - میں نے خیال کیا کہ جب یہ آم خود ایسے ہیں ، پھر میرے ساتھ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں - الغرض کھانا کھایا ، بہت مزیدار

اور خوشگوار تھا ۔ قورمہ ، قلیہ ، شیرمال ، پلاؤ ، زردہ ، شیر برنج ، متنجن ، کباب ، پراٹھا سب کچھ تھا ۔ بعد کھانے کے آم چوکھانے بیٹھا ، صورت حرام نظر آئے ، بالکل کھٹے ۔ میں یورب کے آم کھائے ہوئے تھا ، بڑی نفرت ہوئی ۔ اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھائے ، اس سے کہیں بہتر پائے ، پھر تو میں نے نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا ۔ وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے : ''کھانا نہ اسے کہ یہ پرائے ہیں آم'' اور سب آم منگا لیے ۔ آم کا شوق حضرت کو بہت تھا ۔ الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا ، آموں کی بہت تعریف کی ۔ قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا ۔ صبح کو ''فیض صغیر رسالہ'' تانیث تذکیر'' کا مسودہ لےکر گیا ، حضرت نے خود لے کر اسے دیکھا اور بے عینک کے دیکھا ۔ دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا اور بہت تعریف کی اور اس کی تقریظ لکھ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھ چھپی ہے اور 'عود ہندی' میں بھی موجود ہے ۔ ہر روز کی ملازمت سے طبیعت بہت محظوظ ہوتی رہی ہے ۔

''ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب ہی کے حاضر تھا ۔ بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیو گے ؟ میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو بلوائیے ۔ ہنس کر بولے ضرور ، اور آدمی کو پکار کر کہا فلاں کنوئیں سے پانی لے آؤ ۔ میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا ۔ فرمایا برف ہی کا ہے ، غرض پانی آیا ، پیا ، واقعی سرد تھا ۔ فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے ۔

''ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا اور مذہب کو استفسار کیا ۔ ماموں صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا منہم ، اور میری طرف اشارہ کر کے فرمایا منّا ۔

''ایک دن مرثیے کا ذکر آ گیا ۔ فرمانے لگے کہ میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا ، تین بند کہہ کر دیکھا تو ''واسوخت'' ہو گیا ۔ وہ بند یہ ہیں :

مرثیہ فرمودۂ حضرت غالب

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیان شہ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن و طاقت غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہر دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ خرگہ ُند پایہ جو مدت سے بجا ہے[1]
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے
کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا[2]
کچھ اور ہی نقشا ہے دل و چشم و زباں کا[3]
کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا
ہو گا دل بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے[4]
گرتا نہیں اس رو سے کبھو برق نہیں ہے

پھر فرمایا واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے ، دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لیے معمولی پلاؤ ، قورمہ ، قلیہ ، شیرمال وغیرہ بھیج دیتا ہے ۔ آج آپ میرا کھانا دیکھیے ۔ الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا ۔ ایک دستر خوان بچھایا گیا ، اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا ، اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں ، اور ایک تانبے کی رکابی میں تین پھلکے روے کے ، اور ایک رکابی تانبے کی خالی ۔ پھر وہ رفیق آ کر بیٹھے ، انھوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے ، اور خالی رکابی میں رکھے ، اور پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور تھوڑا شوربا لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر دو لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا ۔ اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اترے اور دسترخوان پر آ بیٹھے ۔ پہلے وہ دونوں لقمے نوش جان فرمائے ، اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے ۔ البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا ۔ بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا

۱- دیوان غالب ، نسخہ عرشی : . . . بپا ہے ۔
۲- ایضاً : کچھ اور ہی عالم ہے دل و چشم و زباں کا
۳- ایضاً : کچھ اور ہی نقشا نظر آتا ہے جہاں کا
۴- ایضاً : اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے

ملا ملا کر کھائے ۔ اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا اور کھا چکے ، اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے ۔ شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں ۔

"ایک دن نواب ضیاء الدین خاں نے میری دعوت کی ۔ بہت تکلف سے کھانا کھلایا ۔ میں ان کے کھانوں کی تعریف نہیں کر سکتا ۔ بہت دیر تک باتیں ہوا کیں ۔ ایک دن مولوی صدر الدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے ۔ ان کے فیض سے بھی کام یاب ہوا ۔

"ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا ۔ وہ میلا بھی قابل دید تھا ، دہلی کا میلا کیا کہنا ہے ۔ میں نے دہلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی ۔ جامع مسجد کو دیکھا ، سبحان اللہ کیا کہنا ہے ۔ تبرکات کی زیارت کی ۔ جناب امیر اور حسنین علیہم السلام کے دست مبارک کے قرآن لکھے ہوئے دیکھے ، خط کوفی میں تھے ۔ چوک کی سیر روز کرتا تھا ۔ بازاروں میں روز پھرتا تھا ۔ مگر دہلی عجب مقام ہے ، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں ۔ چیزوں کی خریداری کرو ، دام پوچھو ، چیز لو ، دام دو ۔ کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو ، کہاں کے رہنے والے ہو ۔ خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے ، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے ، وہاں کی غزلیں میرے دیوان "خمخانہ" میں چھپی ہیں ۔ چند شعر ان غزلوں کے یہ ہیں[۲] ۔

"غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی ، خوب لطف اٹھائے ۔ آخر رمضان ، ۱۲۸۲ ہجری تک آرے چلے آئے ۔ جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے ، خط و کتابت جاری رہی ۔ آخر ۱۲۸۵ ہجری میں انتقال فرمایا ۔

کلام معجز نظام ان کا فارسی اور اردو ہر جگہ موجود ہے مگر دو غزلوں میں سے کچھ لکھے دیتا ہوں ۔ ایک وضعِ اول کی اور دوسری وضعِ ثانی کی[۱] ۔"

صفیر نے دہلی کے قیام میں غالب سے متعدد ملاقاتیں کیں ۔ اوپر کے بیان میں پہلی ملاقات کی تفصیل اور چند دیگر ملاقاتوں سے متعلق واقعات درج ہوئے ہیں ۔ مومن خاں مومن کے حالات لکھتے ہوئے بھی صفیر نے "جلوۂ خضر" جلد اول(صفحات ۲۴۰—۲۳۵) میں غالب سے ایک ملاقات کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

"مجھ سے اور غالب علیہ الرحمہ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان

۱- اس کے بعد صفیر کی دو غزلوں کے اشعار ہیں ۔

۲- اس کے بعد غالب کی دو غزلوں سے نہیں بلکہ تین غزلوں سے ۱۶ شعر درج کیے گئے ہیں ۔

کے بارے میں گفتگو ہوئی اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالے ۱ کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے - جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے ، حضرت نے دیکھ کر فرمایا ، ہاں اس کو دیکھو ، یہ ایک چیز میں نے ان دلوں بہ فرمائش ڈاکٹر صاحب لکھی ہے - اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے ، کوئی پانچ چھ جزو کا رسالہ تھا - جناب ڈاکٹر صاحب نے مولف کے نانا حضرت صاحب عالم صاحب کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجیے - چناں چہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا ، مگر میں نے اس کا مسودہ درست کرکے بھیج دیا تھا ، پھر خدا جانے کیا ہوا - اسی طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا - وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے - الغرض اسی رسالے کے پڑھنے میں کچھ دہلی لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا - فرمایا ، میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا - اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے ، مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے ، ہاں قواعد لکھ نہیں گیا - قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے - ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا ، مگر یاد رہے اس مضمون میں دلی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا - پھر ہنس کر فرمانے لگے ، اس زبان پر اس کے سوا اور ہوتا کیا - میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا ، جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا ، مگر یاروں نے چلنے نہ دیا - اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کا ہے - میاں ! جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا ، جیسا تم نے ولی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں ، اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے ، اس وقت فارسی کی شاعری دہلی میں بہت چمکی تھی ، مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی ، اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی دان سب اس کی تقلید پر چلنے لگے اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہ سپری

۱- اس سے مراد ''نکات و رقعات غالب'' ہے جو فروری ۱۸۶۷ء (مطابق شوال ۱۲۸۳ ہجری) میں چھپا -

کی ۔ مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دیتا تھا ، کچھ ایسی دقت نہ ہوئی ۔ پھر بھی جتنے لوگوں نے ادھر توجہ کی ، ہر ایک کی ایک نئی طرز ہو گئی ۔ مگر ناسخ کے کلام نے (جس کو علم درکار تھا اور قاعدے کے پرتو پر ڈالا گیا تھا) دہلی میں آ کر سب کو حیران کر دیا اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا دلوں کو بر انگیختہ کرنے لگا یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا ۔ اس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام برآوردہ تھے : میں اور مومن خاں اور ذوق ۔ ذوق نے ادھر کم رغبت کی کیوں کہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی ، زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں [؟ تھے] ، مگر مومن خان نے خیال کیا ۔ پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے ۔ شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے ، مگر مومن خاں نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی ۔ ادھر میں نے بھی ۔ غرض ہم دونوں دہلی کی طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے ۔ مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی اور کوئی ناسخ سے نہ ملی ۔ میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خاں اپنے اسی رنگ میں رہے ۔ خلاصہ یہ کہ دہلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے اور اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا ، جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہو گئی، وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے ۔ ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھ ہوا وہ کیا ۔ مگر یاد رہے کہ مضمون دہلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے ۔ ایک تمہارے بحر صاحب فرماتے ہیں :

نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی ، بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ کھڑے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے ۔ اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور چند شعر پڑھے ۔ میں نے عرض کی حضور یہ سب سچ فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جائے اور باندھنے سے کام ہے ، عشق و عاشقی ان کی بلا جانے ۔ نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق ۔ ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہو بہو ہو جاتا ہے ۔

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں ؛ میں چھپرہ میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا ، وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے ۔ دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے ۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے ، میں نے چند شعر پڑھے ۔ منجملہ ان کے ایک یہ شعر بھی پڑھا :

کس وقت سے ہم جام ہتھیلی پہ لیے ہیں
لو تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے ، آپس میں کہنے لگے بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے ۔ جناب پھر پڑھیے گا ۔ میں نے پھر پڑھا ۔ ان لوگوں نے اس شعر کو لکھ لیا اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں ، اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا ، فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے ۔ حضور مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آ جائے اس کو باندھ دینا چاہیے ۔ کیا غریب معشوق نہیں ہو سکتا ؟ ہر ایک کا معشوق الگ ہوتا ہے ۔ کسی کو گورا پسند ہے ، کسی کو سانولا ۔ ''معشوق منست آنکہ بہ نزدیک تو زشت است'' کا حال ہے ۔ یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا بے شک ایسا ہی ہے ، مگر میاں میں[1] نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے ؛ وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودکی (کذا) اور فردوسی سے لے کر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہم تک ایک گروہ ہے ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے

۱۔ یہاں سے ''مگر مجھے کوئی ان کا شعر یاد نہیں'' تک کی تمام عبارت ''عود ہندی'' میں چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے ایک خط میں موجود ہے (عود ہندی ، نول کشور ، ۱۸۷۸ع ، صفحات ۳۶ - ۳۵)۔ غالب کے خط کا متعلقہ حصہ درج ذیل کیا جاتا ہے ۔ وہ عبارت و الفاظ جو صفیر کے بیان اور غالب کے خط میں مشترک ہیں ، ان کی جگہ نقطے لگا دیے گئے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ صفیر نے غالب کے خط میں کس قدر ترمیم کی ہے ۔

''اس رقعے میں ایک میزان عرض کرتا ہوں ۔ حضرت صاحب عالم ان صاحبوں کے کلام یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل ، واقف سے لے کر بیدل ، ناصر علی تک اس میزان میں تولیں ۔ میزان یہ ہے کہ رودکی و فردوسی . . .

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

تفاوت سے ایک وضع پر ہے ، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے ۔ سعدی و جامی و ہلالی ، یہ اشخاص متعددہ ہیں ۔ فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا ، خیالہاے نازک اور معانیِ بلند کا ۔ اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری وعرفی و نوعی نے ، سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی ۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا پرداز دیا ۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں ۔ رودگی (کذا) و اسدی و فردوسی ، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی تحریر نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا ۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے ۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں ؛ خاقانی اس کے اقران ، ظہوری اس کے امثال ، صائب اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

تک ایک گروہ ۔ ان حضرات . . . یہ اشخاص متعدد نہیں ۔ فغانی . . . معانی بلند ۔ اس شیوہ . . . . سلاست کا چربہ دیا . . . . حکیم شفائی . . . . اور سعدی کی تحریر نے . . . . تین ٹھہری ہیں ۔ خاقانی . . . . نظائر ۔ خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے ۔ بے شبہہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے ۔ پس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز چوتھی ہے ۔ کیا کہنا ہے ، خوب طرز ہے ۔ اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے ، ہندی ہے ۔ دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے ، ٹکسال باہر ہے ۔ داد داد ، انصاف انصاف ۔ نظم ۔ اگرچہ شاعران نغز گفتار . . . . ۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفیر نے ''خالصاً للہ'' سے ''انصاف انصاف'' تک کی عبارت حذف کرکے ایک دوسری عبارت درج کر دی ہے ۔ غالب کا خط صفیر سے ملاقات سے پہلے کا ہے یعنی ۱۸۶۳ع (۱۲۸۰ھ) کا ۔ ممکن ہے غالب نے صفیر سے اس قسم کی گفتگو کی ہو اور صفیر نے ''جلوۂ خضر'' کی تصنیف کے وقت اس گفتگو کو حافظے سے قلم بند کرنے کی بجائے ''عود ہندی'' سے نقل کر دیا ہو ۔ یہ خط صفیر کی نظر میں تھا اور ایک جگہ انھوں نے اس کا حوالہ بھی دیا ہے :

''حضرت غالب نے عود ہندی میں ایک میزان درست کی ہے جس میں ان شعرا کے نتائجِ فکر کو دکھایا ہے . . . .'' (جلوۂ خضر ، جلد دوم ، صفحہ ۹۰) ۔

یہاں غالب کے مذکورہ خط ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

کے نظائر ، اب ان میں جس کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہوگیا جس کو بظاہر عشق مجازی کا زینہ آخر اور حقیقی کا زینہ اول کہہ سکتے ہیں ، ان کا کیا پوچھنا ، اور جو مجازی میں پورے نکلے وہ بھی ان کے قدم بہ قدم ٹھہرے اور ان کے بعد کے درجے والے سب حقیقی میں ہیں :

اگرچہ شاعران نغز گفتار — ز یک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں — خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ چیز دگر حصے میں پارسیوں کے آئی ہے ، ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے ، جیسے میر تقی میر :

بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا : دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم : قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیونکر مانوں
ہے تو ناداں ، مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

مومن خاں : تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کم تر ، آتش کے یہاں بیشتر ، یہ تیز نشتر ہیں ، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں ۔ میں نے التماس کیا کہ میں ان لوگوں کے شعر عرض کروں ؟ فرمایا ہاں پڑھو :

ناسخ : یہی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا
کہ اک ذات خدا ہے اور میں ہوں

جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم — وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سروکار مہرباں — کرتے رہو جفا ہی ، وفا گر نہ ہو سکے
مر چلا ہوں امیدواری میں — ایسی ہاں سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سن کر حضرت غالب نے فرمایا ، ہاں ، ان میں بعض نشتر ہیں ۔ پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے :

آتش : آئے بھی لوگ ، بیٹھے بھی ، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

دمِ آخر بھی بالیں پر مرے ہم راہِ یار آئے
رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک ، دل سے نازک خوے دوست

سجدۂ شکر خدایا میں کئی رکھتا ہوں
قدمِ یار پہ ہے سر کو جھکانا شبِ وصل

یہ شعر سن کر فرمایا ، ''ان میں بھی بعض'' ۔

صفیر کے مذکورہ بیان کے بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں[1] :

''میر صفیر مرحوم کے بیان میں بعض باتیں محل نظر معلوم ہوتی ہیں ۔

۱- میرزا کا دبیر کو بے مثال قرار دینا اور انیس کا ذکر تک نہ کرنا ۔

۲- میرزا کی غذا ، اس کے متعلق حالی اور صفیر کے بیان میں بہت فرق ہے ۔

۳- فارسی شاعری کی مختلف طرزوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ، وہ لفظ بلفظ میرزا کے ایک خط سے ماخوذ ہے جو اردوئے معلی[2] میں موجود ہے - حیرت کی بات یہ ہے کہ بجنسہ انھیں الفاظ میں خیالات کا اظہار دوبارہ کیا گیا ، اور جو باتیں خط کی تحریر کے وقت یاد نہ آئی تھیں وہ تقریر کے وقت بھی فراموش رہیں ۔ مثلاً ناسخ و آتش کے اشعار ۔

۴- میر صفیر مرحوم ناسخ کے شاگرد کے شاگرد تھے ، لیکن ناسخ سے جو عقیدت انھیں تھی وہ ان سے براہ راست مستفید ہونے میں بھی کسی کو نہ ہوگی ۔ جب وہ ناسخ کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو قصیدے کا انداز آ جاتا ہے ، اس لیے یہ بخوبی ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر ناسخ کے متعلق کچھ ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہوں جو در اصل غالب کی بہ نسبت خود ان کے ذاتی خیالات سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں ۔''

قاضی صاحب کا خیال درست ہے کہ صفیر کے بیان میں مندرجہ بالا امور محل نظر ہیں ۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیس برس بعد جب وہ غالب

۱- مقالہ ''میر صفیر بلگرامی اور میرزا غالب'' مطبوعہ سہ ماہی ''اردو'' ۔ جنوری ۱۹۳۸ء ، صفحہ ۳۰ ۔

۲- جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ، یہ خط عود ہندی میں بھی شامل ہے ۔

کی باتوں کو تحریر کرنے بیٹھے تو ممکن ہے کہ ان کے حافظے نے اصل واقعات میں کچھ "رنگ آمیزی" کر دی ہو۔

تقریظ رشحات صفیر :

بقول صفیر، دہلی میں غالب سے ملاقات کے دوران میں صفیر نے اپنی کتاب "رشحات صفیر" (رسالۂ تذکیر و تانیث) کا مسودہ انھیں دکھایا۔ غالب نے "دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا" اور صفیر کو اس کی تقریظ لکھ کر دی۔ صفیر کے بیان کا دوسرا حصہ محل نظر ہے۔ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ صفیر نے غالب کو رسالۂ تذکیر و تانیث کا مسودہ دکھایا ہو لیکن یہ درست نہیں کہ انھوں نے "تقریظ" بھی فوراً لکھ دی ہو۔ ڈاکٹر مختارالدین آرزو کو صاحب عالم مارہروی کی خود نوشت بیاض سے ایک خط ملا تھا جو انھوں نے علی گڑھ کالج میگزین کے غالب نمبر (صفحہ ۹۷) میں چھپوا دیا تھا۔ یہ خط ۲۹ اگست ۱۸۶۶ء کا مکتوبہ ہے۔ اس میں غالب لکھتے ہیں :

"دیباچے کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ لخت جگر و نور بصر مولوی سید فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں۔"

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے دیباچہ (یا بقول صفیر 'تقریظ') لکھ کر صفیر کو نہیں دیا تھا، بلکہ صاحب عالم کو بھیجا تھا اور انھوں نے صفیر کو بھیجا۔ اس سلسلے میں سید برکات حسن کا ایک خط بھی ملتا ہے جو "انشاے سبد گل" میں شامل ہے۔ اس میں برکات حسن لکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ ۔ اس سے پہلے میں نے تم کو تقریظ مرزا نوشہ غالب کی بھیجی، تم نے آج تک اس کی رسید نہ لکھی اور نہ شکریہ اس کا مرزا صاحب کو تحریر کیا۔ آخر کو مرزا کا شکوہ آیا۔ براے خدا اس منحوس عادت کو چھوڑو، خط کا جواب لکھا کرو۔" (صفحہ ۷۳)

ظاہر ہے کہ اگر دیباچۂ غالب، صفیر خود دہلی سے لکھوا کر لائے ہوتے تو مذکورہ خطوط لکھنے کی نوبت نہ آتی۔

"رشحات صفیر" کا دیباچہ "عود ہندی" میں پہلے چھپا اور "رشحات صفیر" میں بعد میں۔ دونوں جگہ اس دیباچے میں بعض لفظی اختلاف ہیں۔ ذیل میں یہ دیباچہ "رشحات" سے نقل کیا جاتا ہے، حواشی میں "عود ہندی" (نول کشور ۱۸۷۸ء) کے اختلافات کی وضاحت کر دی گئی ہے :

تقریظ رسالۂ رشحات یعنی کتاب تانیث و تذکیر حصہ ہفتم مجموعہ فیض صفیر، بقلم خاص حضرت غالب دہلوی علیہ الرحمہ۔

''سیدی سندی ، نور بصر ، لخت جگر[1] ، قرۃ العین اسد ، مولوی سید فرزند احمد کے طول عمر و دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جن کو مبدء فیاض سے اس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے ۔ سبحان اللہ[2] تفرقہ تذکیر و تانیث کی تقریر کہ وہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے ، کس لطف سے ادا ہوئی ہے ، ہر چند اس راہ سے کہ سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں ، قواعد تذکیر و تانیث کے منضبط نہ ہونے کے خود معترف ہیں ۔ لیکن قوت[3] علم اور حسن فہم اور لطف طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم[4] پہنچائے ہیں ، مجھے دل سے پسند آئے ہیں ۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظور انظار[5] اولوالابصار رہے گا ۔ جو صاحب اس کو مطالعہ فرمائیں گے ، نفع بھی پائیں گے اور لطف بھی اٹھائیں گے ۔ مولف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں ، رئیس جلیل القدر[6] آرہ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں ، سید واسطی بلگرامی ہیں ، جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں ۔ ان حضرت کا مادح گویا اپنا ثناخواں ہے ، جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمۃ کا بیان ہے :
مادح خورشید مداح خود است که مرا دو چشم سر نامرمد است[7]
داد کا طلب غالب ۔ ۱۲ [مہر غالب] محمد اسداللہ خاں ، ۱۲۸ ہجری ۔''

یہ دیباچہ رشحات کی طبع ثانی (۱۳۰۲ ہجری) میں شامل نہیں ۔ رشحات کی طبع اول میں حضرت صاحب عالم مارہروی کی تقریظ بھی شامل ہے ۔ اس تقریظ

۱- عود : ''نور بصر و لخت جگر ۔''
۲- عود : ''سبحان اللہ تانیث تذکیر کی تقریر . . . . '' ۔
۳- عود : قوت علم و حسن فہم و لطف طبع ۔
۴- عود : '' . . . . بہم پہنچائے ہیں کہ اور صاحبوں کے دل کی دوسرے کو کیا خبر مگر مجھے تو دل سے . . . . ''
۵- عود : نظر ۔
۶- عود : . . . . جلیل القدر عظیم آباد و آرا اور . . . . .
۷- کہ دو چشم روشن و نامرمد است (مثنوی معنوی ، مرتبہ نکلسن ، لیڈن ، ۱۹۳۳ع ، دفتر پنجم ، صفحہ ۳) ۔

میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں ہے :

''ملک الشعرائے ہندوستان ، استاد ہمہ دان دقائق فارسی و ہندی زبان ، نواب محمد اسد اللہ خان صاحب غالب تخلص نے تقریظ اس پر قلمی فرمائی ، قدر و منزلت مولف و تالیف بڑھائی - بعد تحریر خدمت موصوف کے حاجت و ضرورت دوسری تحریر کی کب ہے -''

غالب و صفیر کے تعلقات کی داستان بظاہر یہاں ختم ہوجاتی ہے ، لیکن بالواسطہ تعلق ابھی قائم رہتا ہے - ۱۲۸۳ ہجری میں صفیر کے ہاں لڑکا پیدا ہوا[1] - چودھری عبدالغفور سرور نے نو قطعات تاریخ لکھے اور غالب کو اصلاح کے لیے بھیجے - غالب نے نہ صرف یہ کہ ان کی اصلاح کی بلکہ ''دوسرا قطعہ انھیں پسند نہ آیا اور 'سراسر تکلفات باردہ' لکھ کر انھوں نے پورا قطعہ قلم زد کر دیا - لیکن اپنے دوست اور شاگرد کا دل رکھنے کے لیے ایک اردو قطعہ جیب خاص سے مرحمت بھی کر دیا ہے''[2] - غالب کا 'عطا کردہ' قطعہ یہ ہے :

پور وہ فرزند احمد کو ملا   رحمت باری کا جو گنجینہ ہے
سال تاریخ ولادت یوں لکھا   راحت جاں ہے سرور سینہ ہے

قطعات کی اصلاح کے ساتھ غالب نے سرور کے نام ایک خط بھی لکھا - یہ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۶ع کا مکتوب ہے - اس میں وہ لکھتے ہیں : ''. . . . آرہ میں مولوئ سید فرزند احمد کے مکان کا پتا لکھ بھیجو تاکہ میں ان کو تہنیت لکھ بھیجوں'' - اس سے ڈاکٹر مختارالدین آرزو نے یہ نتیجہ نکالا ہے : ''. . . . ستمبر [دسمبر ؟] ۱۸۶۶ع سے صفیر و غالب کی باقاعدہ خط و کتابت کی ابتدا ہوئی ہے - اس سے پہلے ممکن ہے حضرت صاحب عالم یا سرور کے خطوں میں وہ دعا و سلام بھیج دیتے ہوں یا ماربرہ ایک آدھا خط انھوں نے لکھا ہو ، لیکن اس وقت انھیں آرہ میں صفیر کے مکان کا پتا معلوم نہ تھا[3] -''

۱- صفیر کے فرزند کا نام سید نور احمد تھا - (پیدائش ۹ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۸۶۶ع - وفات ۲۰ محرم ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۰ جون ۱۸۹۸ع) - سید وصی احمد بلگرامی ، انھی سید نوراحمد کے فرزند ہیں -

۲- مقالہ ''غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور چند اصلاحیں'' از مختار الدین آرزو ماہنامہ ''آج کل'' بابت فروری ۱۹۵۵ع ، صفحہ ۳ -

۳- ایضاً ، صفحہ ۳ -

یہ بیان محل نظر ہے - غالب و صفیر کی خط و کتابت ۱۲۸۰ ہجری سے شروع ہوئی تھی اور غالب کا آخری خط ے ذی الحجہ ، ۱۲۸۱ ہجری کا ملتا ہے - رہی یہ بات کہ غالب نے صفیر کا پتا دریافت کیا تھا تو ممکن ہے کہ سرور کو خط لکھتے وقت انھیں صفیر کا پتا یاد نہ رہا ہو ، ورنہ آرے کے پتے پر ان سے صفیر کی خط و کتابت رہ چکی تھی - مکتوب غالب بنام سرور کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی صفیر سے دوبارہ مراسلت ۱۸۶۶ع میں شروع ہوئی ہوگی - لیکن ابھی تک غالب کا کوئی ایسا خط (بنام صفیر) دستیاب نہیں ہوا جو ۱۲۸۱ھ کے بعد کا ہو -

یہاں تک صفیر و غالب کے باہمی تعلقات کی داستان بیان کی گئی ہے - اب ذیل میں صفیر کی مختلف تصانیف میں غالب سے متعلق ایسی تحریروں کو یک جا کیا جاتا ہے جن سے غالب کے حالات پر روشنی پڑتی ہے یا غالب کی شاعری کے بارے میں صفیر کی رائے معلوم ہوتی ہے -

انشائے سبد گل :

اس کتاب کی تفصیل اس مقالے کی ابتدا میں لکھی جا چکی ہے اور اس کے حوالے سے خطوط غالب بنام صفیر درج کیے جا چکے ہیں - اب چند ایسے مکتوبات پیش کیے جاتے ہیں جن میں غالب کا ذکر ہے - ان خطوط سے غالب کے آخری زمانے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے -

مکتوب سید صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ، بنام صفیر :

''حال و اضمحلال مرزا نوشہ صاحب کمال ملال داد - او تعالیٰ در عمر و صحت شان بیفزاید - شنیدہ ام کہ از گران سمعی دوات و قلم نزد شان می باشد - مردمان کہ برائے ملاقات می روند ، حالات خود را تحریر کردہ می دھند - جواب زبانی یا قلمی می یابند - برخورداران مقبول عالم و سید آل محمد و سید برکات حسن رفتہ دیدہ آمد . . . .'' (صفحہ ٦)

صفیر نے اس کے جواب میں لکھا :

''احوال جناب غالب مدظلہ از اعتذار شان کہ طبع شدہ ، مشتہر گردیدہ معلوم شد و تحسر بر تحسر افزود کہ حالا زمانۂ شان آخر است خداوند تعالیٰ از قدرت کاملۂ خود دریں پیرانہ سری قوتے بخشد کہ از باقی ماالدگان ہند و مغتنم زمانہ ہستند - عریضۂ بخدمت شان روانہ کردہ ام تا جواب چہ آید -'' (صفحہ ۷)

صفیر نے غالب کے نام جو خط لکھا ہوگا ، اس کا جواب شاید نہیں آیا ، ورنہ صفیر اسے بھی شائع کر دیتے ۔

سید مقبول عالم ، غالب سے اپنی ملاقات کا حال صفیر کے نام ایک خط میں ان الفاظ میں لکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ ۔ نیمہ' شوال خیر مآل گزشته ، راقم آثم را معہ برادر صاحبان سید آل محمد صاحب و سید برکات حسن صاحب بہ پیش آمد تقریب سفر میرٹھ از مارہرہ حرکت داد ۔ غلطم ، مایان کجا و چرا می رفتیم ۔ علت غائی استحصال ملازمت جناب غالب بود ، ورای ما سہ برادر عزیزی مظہر علی نیر؛ بالا میان صاحب مرحوم از کمال اشتیاق مرزا صاحب ترک روزگار کرده ، با ما ہم باشد ، القصہ :

برفتیم قاصد بدیدار مرد

مگر افسوس جز ایں کہ جسم باجان و چشم نگران و زبان جنبان یافتیم از ۔ ۔ ۔ ۔[۱] مرزا صاحب چہ خبر دہم ۔ سامعہ مفقود ، حافظہ نابود ، قوای حساسہ معطل ، دماغ مختل ، پرچہ' اعتذاری بالانطباع داده اند ، عنوان آن باین شعر نہاده اند :

دیگر از خویشم خبر نبود تکلف بر طرف
این قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ملاقاتی کہ از دیدن میر امامی عمون صاحب و قبلہ مغفور برداشتہ بودم ہمان و ہمچنان از ملاقات مرزا صاحب حاصل و کمال تاسف بدل و جان واصل شد ۔ بخدمت نانا صاحب شاہ بیتی نوشتہ فرستاده اند کہ ہرگاہ داعی اجل را لبیک گویم این بیت را بند قرار داده ترجیع بند فرمایند ۔ این ست :

رشک عرفی و فخر طالب مُرد   اسد اللہ خان غالب مُرد

چہار روز اتفاق قیام دہلی افتاد ، ہر روزه بخدمت مرزا صاحب حاضر می شدم و از اشفاق و اخلاق چہ شرح رود با این ہمہ ناتوانی و نیم جانی چندان مبذول می فرمودند کہ خاطر ترک مجالست را نمی خواست و پا بر نمی خاست ۔ وقت رخصت بجائیں کلال و ملال دست داد ، لطایف و ظرایف این حالت نیز شنیدنی است ، انشاء اللہ تعالیٰ از زبان برادرم سید آل محمد

۱۔ ایک لفظ کتاب کے کرم خورده ہونے کی وجہ سے واضح نہیں ۔

صاحب اصفا خواہد شد - آن عزیز را ہر چہ از نتائج افکار گہر بار درین عرصہ بعد از آمدن جہان خان فراہم شدہ باشد ، بہ ہمراہی برادرم حاجی عبداللہ صاحب لطف کردنی است -" (صفحہ ۸ - ۷)

صفیر اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

"۔ . . . سیر دہلی و ملاقات حضرت غالب مدظلہ حسرتے بمن داد - کاش من ہم‌سایہ آسا ہمراہ می بودم و درین وقت ہم زیارت حضرت غالب می کردم - حیف استادے کہ از باقی ماندگان ہند بود مرحلۂ آخر می پیماید - خدا وند تعالیٰ بر نیم جانیش ببخشاید . . . ۱ کہ دم غنیمت است -" (صفحہ ۸) -

"انشاے مبد گل" میں صفیر نے اپنی اور غالب کی مراسلت کے درمیان غالب کے دو خط میر ولایت علی کے نام درج کیے ہیں - میر موصوف مطبع عظیم المطابع کے مالک تھے ، جہاں سے صفیر کا ترجمۂ بوستان خیال چھپا تھا - افسوس کہ کتاب کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے خط کے ابتدائی حصے کے بعض الفاظ پڑھنے میں نہیں آتے - ایسی جگھوں پر نقطے لگا دیے ہیں - ایک جگہ کتاب ہی میں نقطے لگے ہیں ، یہاں "کذا" لکھ دیا گیا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صفیر نے اس خط کے بعض الفاظ حذف کر دیے تھے - اس خط پر یہ عنوان ہے :
"خط حضرت غالب بنام میر ولایت علی مہتمم مطبع بھی لطف سے خالی نہیں -"
یہ خط پہلی مرتبہ منظر عام پر آ رہا ہے :

غالب کا ایک نایاب خط (۷)

". . . . شفیق مکرم میر ولایت علی صاحب کو خداے جہان آفرین . . . . [تندر] ست رکھے - از روئے اودھ اخبار لکھنؤ بوستان خیال کا ترجمہ مسمی بہ پرستان [خیال] آپ کے مطبع میں آمادۂ انطباع بلکہ دو جلدوں کا منطبع ہو جانا اور دونوں نسخوں کا بہ قیمت ایک روپیہ[۲] ۱۲ آنے کے بشرط ارسال محصول ڈاک ہاتھ آنا معلوم [ہوا] - ۳ ٹکٹ . . . . مالیت دو روپیہ کے بھیجتا ہوں - پونے دو روپے قیمت کے اور چار آنے از روئے قیاس محصول کے . . . . (کذا) فقیر کو آج یہ حال معلوم ہوا ، آج ہی خط معہ محصول روانہ کیا - آپ سے مستدعی بلکہ متقاضی ہوں کہ اسی طرح آپ بھی عجلت کو کام فرمائیے اور جس دن میرا خط پہنچے ، اس کے

۱- چند الفاظ کتاب کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے واضح نہیں ہیں -
۲- ایک روپیہ اصل میں رقمی ہندسے میں تھا - (ادارہ)

دوسرے دن پارسل روانہ کیجیے ۔ صورت تعجیل میں شکر گزار اور صورت توقف میں گلہ سنج رہوں گا ۔ ۸ ذیقعدہ ۔''

[مُہر : محمد اسداللہ خاں ، ۱۲۳۸] (صفحہ ۱۵ - ۱۶)

یہ خط ۱۲۸۱ ہجری کا ہے ۔ اسی روز غالب نے صفیر کے نام بھی ایک خط لکھا تھا ، جو صفیر کے نام خطوط میں درج کیا جا چکا ہے ۔ غالب ، میر ولایت علی کے نام کے لفافے میں ٹکٹ رکھنے بھول گئے تھے ، لہذا دوسرے ہی روز انھوں نے ایک اور خط لکھا ۔ ''انشاے سبد گل'' میں اس کا عنوان یہ ہے ''پرچہ' ثانی حضرت غالب بنام میر صاحب موصوف مشعر اعتذار ۔''

مکتوب غالب (۸)

''جناب میر ولایت علی صاحب ! واسطے اپنے جد کے میری تقصیر معاف کیجیے ، اور حقیقت میں میرا گناہ نہیں :

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

ستر برس کی عمر ، حافظہ معدوم ، نسیان مستولی ۔ کل آپ کو خط لکھا ، لفافہ کرتے وقت ٹکٹ لپیٹنی بھول گیا ۔ آج جو بکس کھولا تو ٹکٹ بکس میں باقی ، ذلیل و خوار و خجل و شرمسار ، آج لفافہ' جدید میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں ۔ خدا کرے پہنچ جائیں ۔ ۹ ذیقعدہ ، غالب یک رنگ ۔'' (صفحہ ۱۵)

یہی خط اس سے پہلے ''رشحات صفیر'' (طبع دوم ، صفحات ۵۸ - ۳۵۷) میں چھپ چکا ہے ۔ ایسے وہاں ''ٹکٹ'' کی تانیث کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے ۔ رشحات میں اس خط کا متن مذکورہ متن سے قدرے مختلف ہے ۔ ذیل میں رشحات کے متن کے مختلف الفاظ درج کیے جاتے ہیں ۔ مشترک الفاظ کی جگہ نقطے لگا دیے گئے ہیں :

خط حضرت غالب علیہ الرحمۃ بنام میر ولایت علی بہ طلب بوستان خیال صفیر بلگرامی

'' . . . . صاحب مہتمم مطبع عظیم المطابع عظیم آباد ، واسطے . . . . کیجیے ۔ در حقیقت میرا گناہ نہیں . . . . حافظہ معلوم (کذا) . . . . کل آپ کو بہ طلب ترجمہ' بوستان خیال مترجمہ صفیر بلگرامی خط لکھا . . . . بکس کھولا ۔ ٹکٹ بکس . . . . خدا کرے کتاب وہاں سے پہلے روانہ ہو اور یہ لفافہ وہاں بعد پہنچے ۱۲ ۔ نجات کا طالب غالب ۔ ۱۶ اپریل ، ۱۸۶۵ع ۔''

قاضی عبدالودود نے یہ خط ''آثار غالب'' (علی گڑھ میگزین ، غالب نمبر ، صفحہ ۲) میں شامل کیا ہے ۔ اس کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں :
''میر ولایت علی کے نام کا خط ''فیض صفیر'' (رشحات صفیر) کی اشاعت ثانی سے ماخوذ ہے ۔ غالباً اشاعت اول میں یہ خط نہ تھا ۔ اور ''فیض صفیر'' کا جو خلاصہ حال میں چھپا ہے ، اس میں بھی یہ خط شامل نہیں ۔ صفیر بلگرامی نے اس خط کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ ٹکٹ مونث بھی ہے ، لیکن مجھے جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ اس سے ٹکٹ کی تانیث ثابت نہیں ہوتی ۔ (خط بنام راقم) میر ولایت علی کے متعلق تحقیقات سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی اور نہ اُس خط کا پتا چلا[1] جو اس سے پہلے غالب نے میر ولایت علی کو لکھا تھا ۔ اس خط کا لفافہ البتہ (کتب خانۂ مشرق بانکی پور میں) محفوظ ہے ۔ اس پر یہ عبارت مندرج ہے : ''در عظیم آباد پٹنہ ، بہ محلہ کشمیری کوٹھی مطبع عظیم المطابع موصول و بہ خدمت جناب میر ولایت علی صاحب مہتمم مطبع مذکور زاد مجدہ ، مقبول باد ۔ پیڈ ، ضروری ، جواب طلب ۔'' لفافے پر مُہر بھی ہے جس کا نقش ''غالب ۱۲۷۲'' ہے ۔ اس لفافے کا عکس ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اُس مقالے کے ساتھ شائع کیا ہے جس کا عنوان ''غالب کے لفافے'' ہے اور جو اپریل ۱۹۳۴ء کے 'ہندستانی' میں چھپا ہے ۔ صفیر بلگرامی جلوۂ خضر جلد ۱ (صفحہ ۲۲۲) میں لکھتے ہیں کہ ''جب میں نے 'بوستان خیال' کو اردو کرکے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعۂ 'اودھ اخبار' مشتہر ہوا ، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس پٹنہ بھیجا ، میں نے ایک جلد بھیج دی ۔'' یہ اسی[2] خط کی طرف اشارہ ہے ، گو مکتوب الیہ میر ولایت علی ہیں ۔ بوستان خیال مترجمہ صفیر کی ایک جلد میں نے لڑکپن میں دیکھی تھی ، اس وقت باوجود تلاش نہ مل سکی ۔ غالباً اور جلدیں نہیں چھپیں ، بلکہ یہ بھی یقین نہیں کہ صفیر نے اور جلدیں بھی ترجمہ کی تھیں ۔''

۱- یہ خط اوپر درج کیا جا چکا ہے ۔
۲- یہ درست نہیں ۔ اس سلسلے میں غالب نے صفیر کو بھی ایک خط لکھا تھا جو اس مقالے میں درج کیا جا چکا ہے ۔ صفیر نے اپنے نام کے اسی خط کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

(صفحہ ۴۴) -

قاضی صاحب نے ''بوستان خیال'' کے ترجمے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے سلسلے میں عرض ہے کہ صفیر بلگرامی نے ''بوستان خیال'' کا ترجمہ ''پرستان خیال'' کے نام سے کیا تھا - ۱۲۸۰ ہجری اور ۱۲۸۱ ہجری میں اس کے دو ''پردے'' (یا جلدیں) یکے بعد دیگرے ''صبح خنداں'' اور ''چمنستان'' کے نام سے چھپے تھے - ''صبح خنداں'' کے خاتمے میں صفیر لکھتے ہیں :

''بعض احباب یہ سمجھتے ہیں کہ عاصی نے 'بوستان خیال' کو انتخاب کیا ہے کہ اٹھارہ جلدوں کو دس جلدوں میں لکھا ہے ، یہ غلط ہے - بلکہ ایک جلد مسمی بہ پردۂ اعظم اور افق الخیال ہے . . . . اس کے بعد یہ جلد صبح خنداں اور پردۂ اول ہے - یہاں سے شاہ زادے کا حال آغاز ہے اور تا بہ پردۂ نہم کہ مسمی بہ شام وصال ہے ، اختتام ہے - اس حساب سے دس جلدیں ہوئیں - اس میں کوئی حال 'چھوٹا نہیں -''

(صفحہ ۱۶ - ۱۱۵) -

افق الخیال ، صبح خنداں اور چمنستان ، ابتدائی تین جلدیں ہیں جن میں سے دو چھپ چکی ہیں - آخری ''شام وصال'' ہے - باقی جلدوں کے نام یہ ہیں : صبح بہار ، چشمۂ خضر ، حباب رعنا ، طلسم اعظم ، فروغ نظر ، ساغر لبریز - بوستان خیال کی تمام غیر مطبوعہ جلدوں کے قلمی مسودے جناب سید وصی احمد بلگرامی کے پاس محفوظ ہیں -

''انشائے سبد گل'' میں ایک اور جگہ غالب کا ذکر ملتا ہے - سید آل محمد مارہروی کے خط کے جواب میں صفیر ایک فارسی غزل بھیجتے ہیں اور لکھتے ہیں :

''حضرت غالب مدظلہ رام پور تشریف لے گئے تھے - خدا جانے آئے یا نہیں - اگر آنے کی خبر ہو تو نانا صاحب کے خط کے ساتھ یہ غزل اصلاح کے لیے بھیج دینا -'' (صفحہ ۳۲)

اس خط پر تاریخ نہیں ہے ، لیکن غالب کے سفر رام پور کی تاریخوں کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط ۲ اکتوبر ، ۱۸۶۵ع اور ۸ جنوری ، ۱۸۶۶ع (مطابق ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ ہجری) کے درمیان لکھا گیا ہوگا -

جلوۂ خضر ، جلد اول :

صاحب عالم مارہروی کا حال لکھتے ہوئے غالب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے :

''. . . . حضرت غالب علیہ الرحمہ کو ان کے ساتھ ارادت خاص تھی - 'پنج آہنگ' اور 'اردوے معلیٰ' اور 'عود ہندی' میں ان کے نام کے مکتوب

اور رقعات بہت ہیں ۔ شعر و سخن کی بحث غالب سے اکثر رہا کرتی تھی ۔ انہیں کی تحریک سے مولف ۱۲۸۳ ہجری میں حضرت غالب کے پاس دہلی گیا اور شاگرد ہو آیا ۔'' (صفحہ ۲۰۰)

جلد اول کے آخر میں اساتذۂ دہلی کے کلام سے محاوراتِ دہلی درج کیے ہیں ۔ اس ضمن میں ''معذرت'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے :

''. . . . میں غالب علیہ الرحمہ کا شاگرد ہوں مگر چوں کہ وہ بھی دہلی کی زبان باندھتے تھے اس لیے ان کے کلام میں بھی جو خلاف محاورۂ لکھنؤ ہیں ، لکھے جاتے ہیں . . . . اگرچہ حضرت غالب نے اکبر آباد کے مطبع اموں جان میں اپنے دیوان کے خاتمے پر ایک معذرت چھپوا بھی دی ہے کہ میرے کلام میں جو الفاظ اور محاورے ناقص بندھ گئے ہیں ، میں کیا کروں ، دہلی کی زبان ہی ایسی ہے ، میں بھی ان کو ناپسند کرتا ہوں ۔'' (صفحہ ۲۸۹)

اس کے بعد ''محاوراتِ دہلی'' سے متعلق سات اشعار ہیں پھر صفیر لکھتے ہیں : ''واضح ہو کہ حضرت غالب کے کلام میں ایک تو محاوراتِ دہلی بہ سبب بندش و ترکیب فارسی کے بہت کم ہیں اور اگر ہیں بھی تو وہ خود ان کو ناپسند کرتے تھے ۔ چنانچہ اکبر آباد کے مطبع اموجان میں جو ان کا دیوان چھپا ہے ، اس کے خاتمے میں اس کی معذرت چھپوائی ہے ۔'' (صفحہ ۲۹۰)

جلوہ خضر ، جلد دوم :

ناسخ کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے صفیر لکھتے ہیں :

''میرے برادر گرامی قدر حضرت سید برکات حسن[1] صاحب بن حضرت سید محمد امیر صاحب سجادہ نشین مارہرہ جب غالب علیہ الرحمہ کی ملاقات کو دہلی گئے اور حضرت نے کچھ اپنا کلام سنایا ، اس مقطع کو بھی پڑھا :

ضعف نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

حضرت برکات حسن نے کہا کہ دیوان میں تو ''عشق نے غالب نکما

۱- حاشیۂ صفیر : یہ مولف کے بہنوئی ہیں اور مولف کے جد امجد کے بھانجے ۔ ان کے بزرگ سینکڑوں برس سے سجادہ نشین قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ ہوتے آئے ہیں ۔ ان کے برادر بزرگ حضرت سید محمد حسن صاحب اپنے والد کے مقام پر سجادہ نشین ہیں . . . .

کر دیا" لکھا ہے - فرمایا ، یہ عشق کا لفظ اُسی زمانے کے واسطے تھا ، اب اس لفظ سے شرم آتی ہے -" (صفحہ ۶۰)

غالب کی نثر کے بارے میں صفیر لکھتے ہیں :

"تاثیر در نثر کے موجد اردو میں اول استادنا حضرت غالب علیہ الرحمہ گنے جاتے ہیں کہ انھوں نے بعدِ ترکِ تحریرِ فارسی اردو میں خط لکھنے کی وضع ایسی نکالی کہ گویا مکتوب الیہ سے باتیں کرتے ہیں -" (صفحہ ۱۰۲)

صفیر نے اپنے حالات میں سید بندہ رضا بلگرامی کا ایک خط درج کیا ہے ، جس کی مندرجہ ذیل عبارتیں غالب سے متعلق ہیں :

"آپ کو اور جناب قدر[1] کو مرزا غالب کی محبت نے ایسا مجبور کر رکھا ہے جیسا قوم نصیری کو حُبِ علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے - حالانکہ میرا بھی اعتقاد ہے کہ مرزاغالب صاحب فارسی میں اکثر اہلِ ہند سے بہتر ہیں مگر اردو میں تو ایک مبتدی لکھنؤ کے مقابل بھی نہیں -

کاوکاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

قابلِ ملاحظہ اور انصاف طلب ہے - . . . . مجھ کو یہ بھی آپ کی اور جناب قدر کی طرف سے اب احتمال ہے ، عجب نہیں کہ مرزا صاحب مرحوم تاریخ بلگرام میں بھی کسی نہ کسی پیرایے سے داخل کر دیے جائیں - میری اس رائے ناقص سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ مرزا غالب صاحب کا غیر معتقد ہوں ، مگر بمقابلہ لکھنو کے دلی والوں کو میں ضرور ناقص سمجھتا ہوں . . . ." (صفحات ۱۸۹-۱۹۰)

صفیر نے اس خط کا جو جواب لکھا تھا وہ بھی دستیاب ہو چکا ہے - یہ خط سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے رسالہ "آج کل" دہلی بابت فروری ۱۹۵۸ء میں چھپوا دیا ہے - صفیر کے خط کا وہ حصہ جو غالب سے متعلق ہے ، ذیل میں درج کیا جاتا ہے - بندہ رضا بلگرامی کا خط ۱۸ مئی ۱۸۸۳ء کا تھا ، صفیر کا جواب ۷ جون ۱۸۸۳ء کا ہے -

"میری تحریر جو اساتذہ کے باب میں ہے یا ایسی ایسی باتوں میں جو میری رائے ہے ، نہ ابھی آپ نے دیکھی نہ سنی - میں اپنے ہوش کے وقت سے کبھی ایسے کا شاگرد نہیں ہوا جس کو سمجھ نہ لیا ہو - محبت اور چیز ہے اور سمجھ اورچیز ہے - سنیے! میں نے جو غالب کو سمجھا ہے ،

۱- قدر بلگرامی جو صفیر کے قریبی عزیز اور غالب کے شاگرد تھے -

حقاً اور ایماناً بیان کرتا ہوں ۔ علم عربی میں تو ان کو محض ناآشنا جانتا ہوں مگر بزور فارسی ان میں ضروری واقفیت کا قائل ہوں ۔ فارسی میں ان سے بڑھ کر کسی شاعر ہند کو فارسی گو نہیں سمجھتا ۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ سنیے ، ہندوستان میں یہی نامی شاعر ہوئے ہیں ۔ (۱) خسرو ، (۲) بیدل ، (۳) آرزو ، (۴) قتیل ، (۵) مظہر جان جاناں ، (۶) فقیر ، (۷) حسن اور (۸) غالب ۔

ان کے سوا غنی کشمیری تھے ، واقف لاہوری تھے ، علی سرہندی تھے اور فیضی . . . . شاعر خاص ہندوستانی تھے ۔ ان میں سے خسرو ، فقیر ، حسن ، ایک پایہ کے اور آرزو قتیل ایک سرمایے کے اور بیدل ، مظہر ، غالب ایک پائے کے ہیں ۔ مگر خسرو اور حسن دہلوی اس وضع کے شاعر تھے جو وضع سعدی کے پہلے تھی جس کو ابوالفضل نے متروک اور ناپسند لکھا ہے ۔ وہ لوگ عرفان مآب تھے ، شاعر نہ تھے ۔ بلند نام اور عالی مقام تھے ، شاعر نہ تھے ۔

آرزو ، قتیل ، نہ الاالذی نہ الاالذی . . . مگر ان کی معلومات کا قائل ہوں ، نہ ان کے مذاق شاعری کا ۔ بیدل ، مظہر ، غالب یہ تینوں بہادران میدان سخن تھے ۔ بیدل اور مظہر نے مضامین عارفانہ کو مذاق شاعرانہ سے ملا کر جیسا کہا ہے ، دل لوٹا جاتا ہے . . . .

غالب جنت آرام گاہ کہ خاتم الشعرائے فرس ہندوستان میں ہوئے ہیں ، ان کی درخشانیِ طبع نے آخر زمانہ میں ہندوستان کا نام روشن کر دیا ۔ کلام فارسی ان کا مشہور اور زبانوں پر مذکور ہے ۔ چند شعر مثالاً لکھے جاتے ہیں :

اے ز ساز زنجیرم در جنوں نواگر کن
بند گر بدیں ذوق ست پارۂ گراں‌تر کن

جنوں مستم بہ فصل نوبہارم می‌تواں کشتن
صراحی در کف و گل در کنارم می‌تواں کشتن
بہ جرم ایں کہ در مستی بپایاں بردہ ام عمرے
بہ کوے مے فروشاں در خمارم می‌تواں کشتن
بہ ہجراں زیستن کفر است خونم را دیت نبود
چراغِ صبح گاہم آشکارم می‌تواں کشتن

حضرت و خدا داور و ہنگامہ بپایاں
اے شکوۂ بےمہریِ احباب کجائی

خود را ہمے بہ نقش طرازی علم کنم
تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

یہ حقیقت شعرائے فارسی گوے ہندوستان کی تھی ۔ اب ان لوگوں میں سے سب نے اردو شعر کہے ہیں ۔ مگر وہ ابتدا تھی ۔ تفریحاً اور تفنناً کہنے کا اتفاق ہوا اور غالب کہ آخر میں ہوئے ، انھوں نے زمرۂ شعرائے اردو میں گنجائش کی اور اردو شاعری بہ طرز خاص کی ، اور طرز خاص کی وجہ وہی ہوئی جو ناسخ کا کلام دیکھ کر اہل دہلی کے لیے واقع ہوئی ۔ مگر سب میں غالب نے جو طرز بیان ایجاد کی بہ نسبت اوروں کے سہل اور صاف ہے ۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں ؛ ایک یہ کہ فارسی ترکیب کے شعر کہے اور اس میں فعل و حروفِ اشارہ فقط ہندی رکھے ۔ جیسے ''کاو کاو سخت جانی . . . .''۔ 'نہ پوچھ' کی جگہ 'مپرس' ہوتا تو فارسی کا مصرع صاف تھا ۔ بخلاف مومن خاں کے کہ ان کے مصرعے ایسے پیچیدہ الفاظ تعضیب و تعقید سے مملو ہوتے ہیں کہ جس سے مضمون میں پیچیدگی آ جاتی ہے ۔ غالب کے یہاں یہ نہیں ۔

دوسری صورت یہ کہ آخر عمر میں غالب نے محاورات اور سلاست کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی فارسی کا مذاق چھپا چھپا ایسا رکھا ہے کہ دل کو لبھا لیتا ہے ، مثالاً چند شعر دونوں طرز کے لکھتا ہوں :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

طرز دوم :

ملتی ہے خوے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو شباب میں

تو ہم لوگ غالب کو اچھا اس سبب سے سمجھتے ہیں کہ طرز ، بندش اور

صفائی بیان میں سب شعرائے دلی سے اعلیٰ اور زبانِ فارسی میں یکتا تھے - اب میں مثالاً ذوق ، مومن ، غالب کا کلام لکھتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ غالب میں صفائی کیسی ہے اور ان دونوں میں گنجلک کیسی :

ذوق : مزے یہ دل کے لیے تھے ، نہ تھے زبان کے لیے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے

غالب : زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

یا

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ مرتے ہیں

مومن : ذرا کر زور سینے پر کہ تیر ُپر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

باق رہی زبان دانی ، ان کے سوائے چند محاورات خاص دہلی کے جس کے خود مرزا غالب قائل ہوئے ہیں ، چہ غالب ، چہ مومن ، چہ نصیر وغیرہ سب دہلوی اور سب لکھنوی ، کہیں کے رہنے والے ہوں بشرطیکہ انہوں نے لکھنو یا دہلی میں نشو و نما پائی ہو اور اساتذہ کے خاندان سے منسوب ہوں ، اول درجہ کے ہیں - اور دوسرا محاورات میں درجہ عوام و خواص کا ہے اور تیسرا درجہ بازاریوں کا ہے -

اور شہروں کے اعلیٰ ترین خواص . . . . اور بازاریوں کے تقابل نہیں . . . . اور یہی رائے انشاءاللہ خاں کی بھی ہے - مگر یہ بات فقط دہلی و لکھنؤ کے واسطے ہے - بہ سبب اجتماع اہل علم و فن کے ، ایسی حالت میں قصباتی یا دوسرے شہر کے رہنے والوں کو تمام اہل دہلی و لکھنو کی تقلید جائز ہے مگر کسی بات میں محاورے اور تذکیر و تانیث میں جب تک اختلاف ان میں نہ ہو اور جس محاورے و تانیث و تذکیر میں اختلاف ہو اس میں سے اسی محاورے کو ماننا چاہیے جس مقام کی تقلید اسے پسند ہو ، یعنی لکھنؤ کی یا دہلی کی - مگر حالی نے کیا خوب کہا ہے :

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح | اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم | لوگ جو چاہیں ان کو ٹھیرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے | ہے ادب شرط ، منہ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت | خاک کو آسماں سے کیا نسبت

غالب کے فارسی کلام کی ترتیب و اشاعت

کلیاتِ غالب (فارسی)

تین جلدوں میں

مرتبہ : سید مرتضیٰ حسین فاضل

صفحات جلد اول : ۵۴۴
صفحات جلد دوم : ۴۰۱
صفحات جلد سوم : ۴۲۳
قیمت پورا سیٹ : ۲۶ روپے
سفید کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں شائع کی گئی ہے

مجلس ترقی ادب ۔ ۲ کلب روڈ ، لاہور

مجموعۂ نثر غالب (اردو)

مرزا کی ۳۳ نادر تحریریں
ادب کے وہ جواہر ریزے جو مجلس ترقی ادب نے یک جا کرکے
حوادث زمانہ کی دست برد سے محفوظ کر لیے

ایک قابل قدر پیش کش

ترتیب ، تہذیب و تحشیہ
خلیل الرحمان داؤدی

صفحات : ۴۲۱
قیمت سفید کاغذ : آٹھ روپے
قیمت اخباری کاغذ : پانچ روپے

مجلس ترقی ادب ۔ ۲ کلب روڈ ، لاہور

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

غالب اور غالب تخلص کے اردو شعرا

اردو شعر و ادب کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو ایک ہی نام اور ایک ہی تخلص کے کئی کئی شاعر نظر آئیں گے ۔ ان میں سے بعض نام ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی طور پر قابل توجہ ہے اور ادب کا شاید ہی کوئی قاری ہو جو ان کے نام سے واقف نہ ہو ؛ مثلاً آزاد ہی کے تخلص کو لے لیجیے : فقیراللہ آزاد، محمد حسین آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد، آزاد سبحانی اور جگن ناتھ آزاد میں سے ہر ایک اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے ۔ یہی حال جعفر علی خاں حسرت اور حسرت موہانی یا ثناءاللہ خاں فراق اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری کا ہے ۔ جگر مراد آبادی اور جگر بریلوی ، جوش ملیح آبادی اور جوش ملیسانی کے نام بھی اسی زمرے میں آتے ہیں ۔ اختر تخلص اکثر شعرا کو راس آیا ہے ۔ قاضی محمد صادق خاں اختر مصنف مثنوی ''سراپا سوز'' اور واجد شاہ اختر سے لے کر علی اختر حیدر آبادی ، ہری چند اختر ، اختر انصاری ، اختر اورینوی، اختر حسین رائے پوری ، اختر شیرانی ، جاں نثار اختر ، سیدہ اختر اور اخترالایمان تک متعدد ایسے ادیب و شاعر ہیں جو تخلص یا نام کے اشتراک کے باوصف اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں ۔ لیکن اس قسم کے ناموں کے بعض ایسے گروہ بھی نظر آتے ہیں جن میں سے صرف ایک ہی نام نے برگد کے درخت کی طرح دوسرے ہم نام شعرا کو اپنے سایہ میں لے لیا ۔ ہمارے ادب میں اس کی ایک واضح مثال مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب کی ہے ۔ ان کا نام افق شاعری پر آفتاب بن کر اس طرح چمکا کہ اس تخلص یا نام کے دوسرے ستارے یکسر ماند پڑ گئے اور اب خواص کے سوا ادب کے عام قاری شاید یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ ہماری شاعری میں غالب تخلص کے اور بھی کئی قابل توجہ شاعر گزرے ہیں ۔ اس لیے اگر آج کی صحبت میں مرزا غالب کے ساتھ غالب تخلص کے دوسرے اردو شاعروں کا ذکر کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا ۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب اُس زمانے کے عام رواج کے مطابق اسد اور غالب دونوں تخلص کرتے تھے - اسد اردو کے لیے تھا اور غالب فارسی کے لیے - بالکل اسی طرح جیسے نواب مصطفیٰ خاں اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی ، یا نواب ضیاءالدین احمد خاں اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کرتے تھے- مولانا حالی نے اسد تخلص کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ اس طور پر لکھا ہے :

''ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنو سے دلی آئے تھے ، مرزا کے ایک شعر کی ان کے سامنے بہت تعریف کی - مرزا نے کہا ارشاد تو ہو وہ کون سا شعر ہے ؟ انھوں نے میر امانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا :

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

شعر میں چونکہ اسد تخلص واقع ہوا تھا ، انھوں نے سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے - مرزا یہ سن کر بہت جزبز ہوئے اور فرمایا کہ اگر کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو لعنت خدا کی -''[۱]

ممکن ہے یہ واقعہ سبب بنا ہو یا اورکوئی وجہ رہی ہو لیکن غالب نے بہت جلد اسد تخلص کو ترک کر دیا اور اردو فارسی دونوں میں صرف غالب کا استعمال کرنے لگے- چنانچہ ایک خط میں خود لکھتے ہیں :

''میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا تھا ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں -''[۲]

بقول عرشی صاحب یہاں دوچار برس سے مراد ان کی شاعری کا دور اول ہے جب کہ وہ مشکل گوئی کو معیار سخن بنائے ہوئے تھے - بعد ازاں انھوں نے اردو فارسی دونوں میں غالب کا استعمال کیا ہے[۳] - لیکن غالب تخلص اختیار کر کے بھی وہ بزم شعر میں اس تخلص کے ساتھ تنہا نہیں رہ سکے - اس لیے کہ غالب تخلص کے اور کئی شاعر اردو شاعری کی تاریخ میں ان کے دوش بدوش موجود

۱- یادگار غالب ، صفحہ ۱۶۲ ، مطبوعہ ملک نذیر احمد تاج بک ڈپو اردو بازار لاہور -
۲- مکتوب بنام منشی شیو نرائن ، مرقومہ ۱۸۵۹ء -
۳- دیباچہ دیوان غالب اردو نسخہ عرشی صفحہ ۱۳ مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ سنہ ۱۹۵۸ء -

رہے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ جس شہرت اور جس مرتبے کو مرزا غالب پہنچے وہ کسی دوسرے غالب کو میسر نہ آیا ۔ پھر بھی ان میں سے بعض ایسے قادرالکلام اور صاحب کمال شاعر ہیں جو اساتذۂ قدیم کی صف میں آتے ہیں اور تاریخ ادب کی گم شدہ کڑیوں کو ملانے کے لیے جن کے حالات وکلام کا مطالعہ بہرحال ضروری ہے ۔ دوسرے یہ کہ غالب کے بعض محققین اور ان کے کلام کے بعض مرتبین نے کچھ ایسی غزلیں اور اشعار بھی مرزا نوشہ غالب سے منسوب کر دی ہیں جو کہ حقیقتاً مرزا نوشہ کے نہیں بلکہ کسی دوسرے غالب کے ہیں ۔ یہ دھوکا محققین کو صرف اس لیے ہوا کہ انھوں نے غالب تخلص کے دوسرے شعرا کے حالات وکلام پر تحقیقی نظر ڈالنے کی زحمت گوارہ نہیں کی ۔ چنانچہ زیر نظر مضمون میں آپ کو اس قسم کی فروگذاشت کی نشان دہی بھی ملے گی ۔ اس سے پہلے ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب نے البتہ اس طرف توجہ کی تھی لیکن جیسا کہ ان کے مضمون کی تفصیلات سے ظاہر ہے کہ چونکہ ان کا اصل مقصود غالب تخلص کے اردو یا فارسی شعرا کے حالات وکلام کا سراغ لگانا نہیں تھا ، بلکہ یہ ثابت کرنا تھا کہ مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب تخلص اختیار کرنے کے سلسلے میں بھی موجد نہیں بلکہ مقلد تھے ، اس لیے ان کا مضمون تشنہ و نامکمل رہ گیا ۔ چنانچہ انھوں نے اگرچہ اپنے مضمون کے ماخذوں میں اردو شعرا کے تذکروں کے ساتھ ساتھ فارسی شعرا کے تذکروں کو بھی شامل کر لیا ہے لیکن دس مطبوعہ تذکروں کے تراجم کے سوا انھوں نے بیشتر اہم تراجم پر نظر نہیں ڈالی[۱]، ان میں دو تذکرے فارسی شعرا کے ہیں ، آٹھ اردو کے ۔ ہماری نظر سے غالب تخلص رکھنے والے اردو اور فارسی شعرا کے ایک سو سے زاید قدیم ماخذ گذرے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان سب کا ایک جگہ سمیٹنا آسان نہ تھا ۔ اس لیے زیر نظر مقالے کو "غالب تخلص کے اردو شعرا" تک محدود کر لیا گیا ۔ اس میں آپ کو تیس سے زاید قدیم ماخذوں کے حوالے ملیں گے ۔ غالب تخلص کے فارسی شعرا اور اسد تخلص کے اردو فارسی شعرا کے متعلق الگ الگ مضامین زیر ترتیب ہیں اور جلد شائع کر دیے جائیں گے ۔

شعرائے اردو کے تذکروں کی جہاں تک ہم نے چھان بین کی ہے ان میں غالب تخلص کے حسب ذیل اردو شعرا کے حالات و منتخبات ملتے ہیں :

۱- غالب - مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالب ۔

۱- تحقیق کی روشنی میں صفحہ ۱۰۷ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور طبع اول ۱۹۶۳ع ۔

۲- غالب - مکرم‌الدولہ بہادر بیگ خاں دہلوی -
۳- غالب - انور علی -
۴- غالب - غالب علی خاں -
۵- غالب - نواب مرزا لٗان علی خاں لکھنوی -
۶- غالب - نواب سیدالملک اسداللہ خاں -
۷- غالب - حکیم محمد خاں -
۸- غالب - لالہ موہن لال -
۹- غالب دکنی -
۱۰- غالب - حاجی میاں -

(۱) مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب کے حالات و کلام کے سلسلے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ بطور تعارف ان کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہوگا - اس لیے غالب کو نظر انداز کر کے غالب تخلص کے دوسرے شعرا کے حالات و کلام پر روشنی ڈالی جائے گی -

(۲) غالب، بہادر بیگ خاں - مرزا نوشہ کے بعد غالب تخلص کے شعرا میں سب سے ممتاز اور اہم حیثیت کے مالک بہادر بیگ خاں غالب ہیں - نواب اعظم‌الدولہ سرور جنھیں بہادر بیگ غالب کے معاصر دوستوں میں شمار کرنا چاہیے اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں :

''غالب مکرم‌الدولہ بہادر بیگ خاں غالب جنگ مرحوم فرزند نواب نیاز بیگ خاں تورانی کہ در عہد نواب ذوالفقار الدولہ مغفور سردارے ذی شوکت بود - بعد رحلت پدر بزرگوار خود بسیار بہ عیش و کام رانی بسر برد - و لک ہا روپیہ در عیاشی صرف نمود - شخص یار بخش ، خلیق قابل ، صاحب مروت بود - پیش از وقت غلام قادر نمک حرام ، در خانہ خود مجلس مشاعرہ منعقد کرد و بہ اقسام اغذیہ ضیافت شاعران می نمود و شب بہ تماشہائے رقص ماہ رویان مع حاضرین محفل بسر می برد - مدعاکہ بہ ہمیں طور بہ ہر طرف کہ خاطرش راغب می شد ، مصروف می‌گشت - در اکثر حرفہ ماہر بود - خصوص ذوق مثنوی نہایت درویش متمکن داشت، از مؤلف تعارف قدیمی بود، اشعار فارسی و ریختہ ہر دو خوب می گفت درسنہ یک ہزار و دو صد و سیزدہ ہجری (۱۲۱۸ھ) بہ آزار

در گذشت خدایش بیامرزد ، از وست -'' :

مت ہو خفا بغل میں گر تجھ کو یار کھینچا
مجبور تھا نشے میں بے اختیار کھینچا

قصہٗ درد و غم اپنا جو سنایا ہم نے
یاں تلک روئے کہ اس کو بھی رلایا ہم نے

دل میں اپنے نہ کرو سوچ کہ کیا ہووے گا
وہی ہووے گا جو قسمت میں لکھا ہووے گا

ہم مر ہی چکے تھے ہجر میں رات
قصہ ہی ہوا تھا مختصر رات

وصل کی کیا رکھیں امید کہ تم نے تو کبھی
کسی کو بوسہ بھی ہرگز نہ دیا ہووے گا

رہتے ہیں آئینے سے ہمیشہ دو چار آپ
تنہا ہی لوٹتے ہیں یہ ساری بہار آپ

زلفوں میں کھینچ کر یہ دل مستمند باندھ
تا پھر نہ کوئی دل کو پھنساوے یہ بند باندھ
خوش قامتوں کی یاد میں ہم بھی فقیر ہو
بیٹھیں گے اک چبوترہ یارو بلند باندھ

قاصد اسے آتا ہوں کبھو میں بھی بھلا یاد ؟
اب جس کی مجھے یاد میں یاں کچھ نہ رہا یاد

اے آہ ذرا خدا سے ڈر کر
اس شوخ کے دل میں ٹک اثر کر

بجلی کے کڑکنے کا ہوں قرباں
شب چھاتی سے لگ گئے وہ ڈر کر

ہم نے لکھ لکھ اسے حال سحر و شام تمام
اپنے ہاتھوں سے خراب اپنا کیا کام تمام

دل ساتھ بتوں کے نہ پھر اتنا تو لگا بیٹھ
گر ہو سکے، کوئی روز کر اب یاد خدا بیٹھ
ساقی ترے اس جام مئے صاف کی دولت
جوں درد و غبار اپنے تو بس دل کا گیا بیٹھ
دیتے ترے کوچے میں کوئی غیر ٹھہرنے
پر یار میں جوں نقش قدم اٹھ نہ سکا بیٹھ[1]

بہادر بیگ خاں غالب کے متعلق گارساں دتاسی نے جو کچھ لکھا ہے وہ یکسر عمدۂ منتخبہ ہی سے ماخوذ ہے ۔ صرف اتنا اضافہ ملتا ہے :

''غالب فارسی میں موزوں سے اور اردو میں ہدایت و فراق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔[2]''

نواب مصطفٰی خاں شیفتہ نے بھی غالب کی بڑی تعریف کی ہے لیکن ان کے حالات زندگی کے سلسلے میں کوئی نئی بات نہیں کہہ سکے ۔ نمونۂ کلام میں انھوں نے حسب ذیل تین شعر نقل کیے ہیں :

بجلی کے چمکنے سے ہے احساں
شب چھاتی سے لگ گیا وہ ڈر کر

۱۔ عمدۂ منتخبہ، صفحہ ۳۴۶ ۔ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، مطبوعہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ع ۔
۲۔ تاریخ ادب ہندوستانی ، جلد دوم (اردو ترجمہ) از لیلیان سکستان صفحہ ۱۲۵ مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔

قصۂ درد و غم اپنا جو سنایا ہم نے
یاں تلک روئے کہ اس کو بھی رلایا ہم نے

رہتے ہیں آئینے سے ہمیشہ دو چار آپ
تنہا ہی لوٹتے ہیں یہ ساری بہار آپ[1]

کریم‌الدین اور فیلن صاحب نے بہادر بیگ خاں غالب کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ گارساں دتاسی کے ترجمے کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ان کے یہاں بھی کوئی نئی معلومات ہاتھ نہیں آتیں ۔ نمونۂ کلام میں وہی تین شعر ان کے تذکرے میں بھی درج ہیں جو ''گلشن بے‌خار'' کے حوالے سے اوپر نظر سے گذر چکے ہیں[2]۔

عبدالغفور نساخ نے غالب کو ہدایت خاں ہدایت کا شاگرد تو بتایا ہے لیکن ان کے استادوں میں موزوں اور فراق کا نام نہیں لیا ۔ نمونۂ کلام میں پانچ شعر دیے گئے ہیں جو اوپر نقل کیے جا چکے ہیں[3] ۔

نصراللہ خاں خویشگی نے حالات زندگی میں صرف تین چار سطریں لکھی ہیں ۔ وہ بھی مبہم اور غیرواضح ۔ نمونۂ کلام میں مندرجہ بالا تین اشعار میں سے آخری دو شعر درج ہیں[4] ۔

اشپرنگر نے بھی کوئی نئی معلومات بہم نہیں پہنچائی ۔ ان کے بیان سے یہ سراغ البتہ لگتا ہے کہ بہادر بیگ خاں غالب کا ذکر عشقی ، قاسم ، ذکا اور سرور کے تذکروں میں بھی آیا ہے[5] ۔

۱- گلشن بے خار صفحہ ۱۳۸ مطبع نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۰ء مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔
۲- طبقات‌الشعرا صفحہ ۳۴۴ مطبع دارالعلوم مدرسہ دہلی ۱۹۴۸ء مملوکہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔
۳- سخن شعرا صفحہ ۳۴۹ مطبع نول کشور پریس لکھنؤ ۱۲۹۱ھ-۱۸۷۴ء مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔
۴- گلشن ہمیشہ بہار صفحہ ۳۴۶ مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۷ء ۔
۵- یادگار شعرا (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۴۸ مطبوعہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۱۹۴۳ء ۔

قطب‌الدین باطن نے بھی غالب کا ذکر بہت ادب و احترام سے کیا ہے ۔ لیکن کوئی نئی بات نہیں کہی ۔ ان کی مقفیٰ انشا پردازی کا اسلوب یہ ہے :

''مجالس مشاعرہ سے از بس شوق تھا تماشائے ارباب نشاط کا ذوق تھا۔''[۱]

نمونۂ کلام میں باطن نے صرف دو شعر نقل کیے ہیں ۔ دونوں شیفتہ کے حوالے سے اوپر درج کیے جا چکے ہیں ۔

محا بدایونی نے صرف دو سطروں میں غالب کا ذکر اس طور پر کیا ہے :

''غالب تخلص مکرم‌الدولہ بہادر بیگ خان خلف نیاز بیگ خان تورانی ، باشندۂ دہلی ، شاگرد ہدایت ، صاحب دیوان تھے ۔ فارسی شعر بھی کہتے تھے'' :

قصۂ درد و غم اپنا جو سنایا ہم نے
یاں تلک روئے کہ اس کو بھی رلایا ہم نے[۲]

عشقی کا بیان اس سلسلے میں اور بھی مختصر ہے ۔ نمونۂ کلام میں صرف ایک شعر درج کیا ہے ۔ اصل بیان یہ ہے :

''غالب دہلوی بخطاب نواب بہادر بیگ خان طالب جنگ خلف نیاز بیگ ۔''

یاں تلک شب کو ہوا سرد ہوئی اے ساقی
پنبۂ صبح ہوا صرف کلاہ شیشہ[۳]

بینی نرائن جہان نے صرف ایک سطر میں تخلص، نام اور وطن کی نشان دہی کر دی ہے لیکن نمونۂ کلام میں انھوں نے غالب کی مندرجہ ذیل تین غزلیں مع مطلع و مقطع دے دی ہیں ۔ ان سے غالب کے رنگ سخن کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے ۔ اس لیے ہم قارئین کے ذوق طبع کے لیے درج کر رہے ہیں ۔

کب رہا ہے اب ہمیں حور و بشر کا امتیاز
دیکھ کر جاتا رہا مجھ کو نظر کا امتیاز

۱۔ گلستان بے خزاں صفحہ ۱۷۰ - ۱۷۱ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ ۔

۲۔ شمیم سخن حصہ اول صفحہ ۱۷۵ مطبوعہ امدادالہند عین‌الاخبار مراد آباد مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔

۳۔ تذکرۂ عشقی صفحہ ۹۹ مشمولہ دو تذکرے جلد دوم مرتبہ کلیم‌الدین احمد مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۳ع ۔

اس کا کوچہ چھوڑ کر جاوے ہے گلشن کی طرف
ہو گیا معلوم بس بادسحر کا امتیاز
نازکی جس نے رگ گل کی نہ دیکھی ہو کبھی
ہو یہاں کیوں کر اسے تیری کمر کا امتیاز
ہے یہ سودائے محبت ہی کہ یاں انسان کو
کچھ نہیں رہتا جہاں نفع و ضرر کا امتیاز
جب نشست اغیار کے پہلو میں ٹھہری یار کی
تب ہمارا رہ گیا پھر واں کدھر کا امتیاز
اہل ہمت بوجھتے ہیں خاک جب اکسیر کو
ان کو کب ہوتا ہے صرف سیم و زر کا امتیاز
آگے اپنے یار کے غالب ہمیں معیوب ہیں
ورنہ ہے کس کے اسے عیب و ہنر کا امتیاز

نغمہ بلبل کا ہے کیا زاغ و زغن کے نزدیک
ہوتی ہے قدر سخن اہل سخن کے نزدیک
ہے جو اعجاز مسیحا کی حکایت مشہور
کچھ بڑی بات نہیں تیرے سخن کے نزدیک
دُرد ہو یا کہ مئے صاف ، پلا اے ساقی
سب مساوی ہے اب اس تشنہ دہن کے نزدیک
اس کی خو بو کو تو کیا جانے بہت دور ہے گل
کیا ہوا رہتی ہے بلبل تو چمن کے نزدیک
اس رخ و زلف کے سودا میں ہمیں اے غالب
شام غربت ہی بھلی صبح وطن کے نزدیک

کاکل نے تجھ کو ہم سے روپوش کر دیا ہے
اپنا چراغ دل کا خاموش کر دیا ہے
تلوار کی تو اپنے پوچھے ہے کیا تمنا
ہر زخم دل نے خالی آغوش کر دیا ہے
آخر کو رفتہ رفتہ اے اشتیاق مژدہ
ہم کو تمام تو نے اب گوش کر دیا ہے

بے وجہ تو نہیں ہے تیرا ملال خاطر
شاید کسی نے تجھ کو ذی ہوش کر دیا ہے

سچ کہیو آہ ظالم کیسی نگہ تھی تیری
جس نے کہ ایک عالم مدہوش کر دیا ہے

ملتے گلے جو ہم سے دیکھا تجھے چمن میں
گل نے تمام تن کو آغوش کر دیا ہے

احساں ہے تیرا ہم پہ اے جذبۂ محبت
نیش جگر سراپا یاں نوش کر دیا ہے

غالب کو کب رہی ہے پروائے جام و ساقی
مست نگہ نے تیری مدہوش کر دیا ہے[1]

ان غزلوں میں سے پہلی غزل کو جس کا مطلع ہے :

کب رہا ہے اب ہمیں حور و بشر کا امتیاز
دیکھ کر جاتا رہا مجھ کو نظر کا امتیاز

بعض مقالہ نگاروں نے بہادر بیگ غالب کی بجائے اسد اللہ خاں غالب کے نام سے نقل کیا ہے ۔ چنانچہ اُردو کے ممتاز محقق مختار الدین احمد آرزو صاحب اس کو مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب سے منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''یہ غزل اشعار کے ایک قدیم مجموعے ہے ، جس کی اشاعت غالب کی زندگی میں ہوئی ۔ ماخوذ ہے ، مجموعے کے نام ''منتخب چمن بے نظیر'' اور ''مجمع الاشعار'' ہیں ۔ سال ترتیب ۱۲۶۸ھ ۔ یہ غزل اس کے صفحہ ۶۴ پر مندرج ہے اور اس کے پہلے سودا اور بعد میں میر کی غزل ہے ۔ خیال ہوتا ہے کہ یہ غزل مرزا غالب ہی کی ہوگی اس لیے کہ ۱۲۶۸ھ میں غالب تخلص کا کوئی اور شاعر اتنا مشہور نہ تھا جو میر و سودا کے پہلو میں جگہ پائے[2] ۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے ۔ مرزا غالب سے پہلے ، جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہوا ہوگا ، بہادر بیگ خان غالب متوفی ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ع

۱۔ دیوان جہاں صفحہ ۱۷۸ تا ۱۸۰ مرتبہ کلیم الدین احمد مطبوعہ پٹنہ مملوکہ قیصر ابن حسن کراچی ۔

۲۔ ملاحظہ ہو علی گڑھ میگزین غالب نمبر صفحہ ۹۶ بابت ۴۸/۱۹۴۹ع مرتبہ مختار الدین احمد آرزو مملوکہ کراچی یونیورسٹی لائبریری ۔

اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے ۔ ان کی وفات کے وقت غالب کی عمر چھ سال کی رہی ہوگی ۔ اردو شعرا کا شاید ہی کوئی ایسا تذکرہ ہو جس میں بہادر بیگ کا ذکر اہتمام سے نہ آیا ہو ۔ ایسی صورت میں انھیں کم شہرت یافتہ سمجھنا درست نہیں ہے ۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا غزل کا انداز بیان صاف بتا رہا ہے کہ وہ مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب کی نہیں ، بہادر بیگ خان غالب کی غزل ہے ۔

"چمن بے نظیر" کا ایک مطبوعہ نسخہ جس کے حوالے سے مختار الدین احمد آرزو صاحب نے یہ غزل مرزا نوشہ غالب سے منسوب کی ہے ، اس کے مولف کا نام محمد ابراہیم موسیٰ ہے اور یہ ۱۲۶۴ھ میں لکھا گیا ہے ۔ "چمن بے نظیر" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے ۔ انجمن ترقی اردو کراچی میں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے اور اس وقت یہی میرے سامنے ہے ۔ اس کے سرورق پر کتاب کا نام اس کے موضوع کی تفصیل یوں درج ہے[1] :

تفصیل کردگار بہ مجمع الاشعار دیوان فارسی و ہندی و نغمہ زبان پوربی المسمیٰ "مراۃ العاشقین" یعنی

چمن بے نظیر فارسی

جس میں دیباچۂ کتاب ، قصائد عربیہ ، غزلہائے فارسی ، مستزاد ، مخمسات ، مقطعات ، رباعیات ، ابیات ، فردیات ، مصرعہ ہائے ضرب المثل ، تلمیحات و صنائع و بدائع و چیستان و تواریخ ۔

چمن بے نظیر ہندی

جس میں غزلہائے شعرائے ہند و قصائد و مستزاد و مثلثات ، مخمسات مسدسات و مثمنات و واسوخت و ترکیب بند و مثنویات و رباعیات و مقطعات و عیدین و دعوتِ ابیات و فردیات و چند غزل بیدل و مناجات و تواریخات متقدمین مرقوم ہیں ۔

۱۔ "چمن بے نظیر" کے تین مختلف مطبوعہ نسخے لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں بھی نظر سے گزرے ۔ ایک میں صرف اردو کا حصہ ہے ۔ یہ مطبع بمبئی کا ہے ۔ دوسرا چمن بے نظیر (فارسی) اور چمن بے نظیر اردو پر مشتمل ہے ۔ ۱۹۲۷ع میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا ہے ۔ تیسرا ۱۸۶۹ع مطابق ۱۲۸۵ھ میں مطبع نول کشور کانپور سے چھپا ہے ۔

نغمۂ دل پذیر

جس میں حمدِ الٰہی ، نعت رسالت ، مناقب ، مناقبِ غوثیہ ، مناقبت خواجہ و مضامین عشقیہ مجازی ، دلچسپ ترانے و دلفریب نغمے اور مثنوی عام پسند طرزوں میں جناب تجمل جلال بوری نے لکھے ہیں[1] ۔"

اس تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ کتاب کا اصل نام "چمن بے نظیر" نہیں بلکہ "مراۃ العاشقین" ہے جسے موضوعات کے اعتبار سے مولف نے تین خاص حصوں میں تقسیم کرکے پہلے دو حصوں کو "چمن بے نظیر" (فارسی) اور "چمن بے نظیر" (ہندی) سے موسوم کیا ہے اور تیسرے حصے کو "نغمۂ دل پذیر" کا نام دیا ہے ۔ اس میں مولف نے اپنی پسند کے شعرا کا کلام ، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے ظاہر ہے ، جمع کیا ہے ۔ لیکن کسی اصول یا معیار کو پیش نظر نہیں رکھا ۔ چنانچہ اس میں جہاں سودا ، غالب ، ذوق ، مومن ، ناسخ ، آتش ، میر ، جرات ، انشا وغیرہ جیسے معروف و ممتاز شعرا کا کلام شامل ہے ، وہاں سینکڑوں گمنام و غیر معروف شعرا مثلاً نیاز ، تجمل ، مشتاق ، یوسف ، عارف ، طور ، علی ، کنور ، عامل ، لطیف ، بخشش ، غنا ، حیرت ، مستان ، دایم ، دلبر ، قلندر ، عشرت ، قدرت ، شادان ، رضا وغیرہ کا کلام بھی کتاب کی زینت ہے ۔ علاوہ ازیں بہت سی غزلیں اور اشعار بغیر کسی نام کے درج ہیں ۔ اس لیے اس کے مندرجات سے آرزو صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا کہ چونکہ "اس کے پہلے سودا اور بعد میں میر کی غزل ہے خیال ہوتا ہے کہ یہ غزل مرزا غالب ہی کی ہوگی ۔" کسی طرح درست نہیں ہو سکتا ۔

اس مجموعۂ اشعار سے مرزا نوشہ غالب کی ایک دوسری غزل کا سراغ ضرور لگتا ہے ۔ اس غزل کا مطلع ہے :

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار ، کہوں یا نہ کہوں

یہ غزل غالب کے متداول دیوان حتیٰ کہ نسخۂ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ہے ۔

۱۔ مراۃ العاشقین مطبوعہ بہ حسن اہتمام قاضی عبدالکریم ابن قاضی نور محمد مالک مطبع فتح الکریم و مطبع کریمی و تاجر کتب بمبئی ۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۳ھ۔

نسخہ مالک رام[1] اور نسخہ عرشی[2] میں البتہ یہ شامل کرلی گئی ہے ۔ اس غزل پر معروف نے سات بند کا ایک مخمس کہا ہے ، یہ مخمس بہ عنوان ''مخمس معروف بر غزل نواب اسد اللہ خاں بہادر'' چمن بے نظیر کے حصہ دوم میں شامل ہے ۔ پہلا اور آخری بند بطور نمونہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :

شرح درد جگر افگار کہوں یا نہ کہوں
ہے مجھے رخصت گفتار کہوں یا نہ کہوں
کچھ تو کہہ اے بت عیار کہوں یا نہ کہوں
اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں

ہے سخن واشد دل کی مجھے معروف مدد
ہوں بہ زندان سخن صورت قفل ابجد
دل میں باتیں بھری جب کہ زیادہ از حد
آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں[3]

یہ مخمس موجودہ دیوان معروف میں بھی شامل ہے[4] لیکن دیوان کے طبع ہونے سے پہلے کا سراغ کریم الدین کے ایک تذکرے میں ملتا ہے اور یہ ''چمن بے نظیر'' سے پہلے مرتب ہوا ہے[5] ۔ لیکن یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ غزل مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب کی ہے؛ اول اس لیے کہ معنی اور اسلوب دونوں لحاظ سے یہ رنگ غالب سے بالکل الگ ہے ۔ دوسرے یہ کہ اس

۱- دیوان غالب ، اردو مرتبہ مالک رام صفحہ ۲۸۳ مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی طبع ثانی ۱۹۶۰ع و طبع اول ۱۹۵۷ع ۔

۲- دیوان غالب ، اردو مرتبہ عرشی صفحہ ۳۹۸ مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۸ع طبع اول ۔

۳- مرآۃ العاشقین (چمن بے نظیر) صفحہ ۲۴۴-۲۴۳ مملوکہ انجمن ترقی اردو فتح الکریم و مطبع کریمی بمبئی ۱۹۰۵ع مطابق ۱۳۲۳ھ ۔

۴- دیوان معروف ، طبع اول صفحہ ۱۶۱ مطبوعہ نظامی پریس بدایون ۱۹۳۵ع مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔

۵- ''گلدستہ نازنیناں'' صفحہ ۲۱۳ مطبوعہ دہلی مطبع سلطانی ۱۸۴۵ع مملوکہ لیاقت نیشنل لائبریری کراچی ۔

مخمس کے سوا اس غزل کی تصدیق کسی اور ماخذ سے نہیں ہوتی - نسخہ حمیدیہ بھی اس سلسلے میں خاموش ہے - کیا عجب یہ غزل سیدالملک نواب اسد اللہ خاں یا کسی دوسرے اسد کی ہو - کلام غالب کے محققین و مرتبین کو اس کا مدلل ثبوت یا مصدقہ ماخذ کا سراغ فراہم کرنا چاہیے -

بہادر بیگ خاں کا قدرے تفصیلی ذکر اعظم الدولہ سرور کے بعد قدرت اللہ قاسم کے یہاں نظر آتا ہے - لیکن چونکہ ان کے سامنے سرور کا تذکرہ موجود تھا - اس لیے غالب کی تعریف و توصیف میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ، وہ سرور کے بیان سے ملتا جلتا ہے - صرف یہ کہ غالب کے اساتذہ کا ذکر سرور کے یہاں نہ آیا تھا وہ قاسم کے یہاں اس طور پر موجود ہے -

''بہ ہر دو زبان سخن می گفت و بر دو دست در معنی می سفت - شعر فارسی بہ سمع میر فرزند علی موزوں می رسانید و ریختہ طبع درباز خود از نظر استاد صاحب درایت ہدایت خاں ہدایت عفی اللہ عنہ و دوستدار سراپا وفاق حکیم ثناء اللہ خاں فراق سلمہ الخلاق می گذرانید[۱] -''

قاسم نے نمونہ کلام کے سلسلے میں غالب کے منتخب اشعار بھی دوسرے تذکرہ نگاروں کے مقابلے میں زیادہ دیے ہیں - اکیس اشعار میں سے دس اشعار سرور کے انتخاب کلام میں بھی شامل ہیں - سرور کا انتخاب ہم پچھلی سطور میں نقل کر چکے ہیں اس لیے اس جگہ بقیہ گیارہ اشعار درج کیے جاتے ہیں :

فرقت میں تیری شب کو زبس دل میں درد تھا
گہ چہرہ سرخ گاہ مرا رنگ زرد تھا

کبھو تو زرد ہے چہرہ کبھو ہے لال اپنا
دکھائی دے ہے عجب دم بہ دم یہ حال اپنا
اگرچہ دل میں تو رہتے ہو پر بہ ظاہر بھی
کبھو کبھو تو دکھایا کرو جمال اپنا

دل تو دیتے ہوئے دے بیٹھے ہم اس کو لیکن
سوچ رہتا ہے یہی دل میں کہ کیا ہووے گا

۱- مجموعہ نغز صفحہ ۱۴ ، جلد دوم ، مرتبہ حافظ محمود خاں شیرانی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۳ع -

اپنے غالب کے تئیں ، نت کا ستانا کیا ہے
کچھ بھلا بھی کرو پیارے کہ بھلا ہووے گا

زلفوں کے بال منہ پر اس کے بکھر رہے ہیں
کیا کیا خیال دل میں ہم اپنے کر رہے ہیں

ہے مجھ کو یہی سوچ کہ اس بزم میں آکر
جو اٹھ گئے کیا کر گئے کیا ہم نے کیا بیٹھ
یک جا کوئی دو شخص فلک دیکھ سکے ہے
پیارے جو تو آتا ہے تو ٹک مجھ سے جدا بیٹھ
ہوتی ہے کوئی جینے کی بے عشق کی لذت
چاہے جو مزا اس کا کہیں دل کو لگا بیٹھ
منزل کو جو پہنچے ہیں یہ کہہ دیجیو ان سے
اک بار کوئی راہ میں ہے تھک کے رہا بیٹھ

گر چہ اپنا نہ رہا ہوش مجھے
پر ہوا تو نہ فراموش مجھے[1]

جنم جی متر ارمان نے صرف ایک سطر میں غالب کے نام ، لقب اور ولدیت کا سراغ دے کر اس غزل کے پہلے تین شعر بطور نمونہ دیے ہیں جو دیوان جہان کے حوالے سے نمبر ۱ پر نقل کی جا چکی ہے[2] - ارمان کے یہاں غلطی سے بہادر بیگ غالب کا ذکر مکرر آگیا ہے - دوسری جگہ انہوں نے غالب کا یہ شعر بطور نمونہ دیا ہے :

رہتے ہیں آئنے سے ہمیشہ دو چار آپ
تنہا ہی لوٹتے ہیں یہ ساری بہار آپ[3]

۱- مجموعۂ نغز صفحہ ۲۴-۲۶ مرتبہ محمود خان شیرانی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۲۳ع -
۲- نسخۂ دلکشا مؤلفہ ۱۲۶۸ھ حصہ اول صفحہ ۱۷۵ ، خطی مسودہ مملوکہ مشفق خواجہ کراچی -
۳- نسخۂ دلکشا مؤلفہ ۱۲۶۸ع حصہ اول صفحہ ۱۷۴ خطی مسودہ مملوکہ مشفق خواجہ کراچی -

مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب کا ترجمہ بھی ارمان کے یہاں دو جگہ ملتا ہے ۔ پہلے اسد تخلص کے ساتھ، بعد ازاں غالب تخلص کے ساتھ ۔ انتخاب کلام البتہ الگ الگ ہے ۔ گویا انھوں نے اسد اور غالب کو دو مختلف شخصیتیں سمجھا ہے[1]۔ بہادر بیگ خان غالب کے متعلق خوب چند ذکا لکھتے ہیں :

''نواب مکرم الدولہ بہادر بیگ بہادر جنگ المتخلص بہ غالب فرزند ارجمند نواب نیاز بیگ خان بہادر ۔ غالب جنگ از امرائے توران بود در عہد ریاست امیرالامرا نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان بہادر بعزت و شوکت تمام می گذرانید ۔ شعر فارسی بہ نظر میر فرزند علی موزوں گذرانیدہ و اصلاح شعر ریختہ از ہدایت اللہ خان ہدایت و حکیم ثناء اللہ خان فراق گرفتہ و نیز بہ میر نصیر سلمہ توسل جستہ ۔ خلاصہ کلام این کہ مردے خوب و از مغتنمات جہان است ۔ بر زور ہم چشان غالب آمدہ و سبب ظاہر در نظر مردم مکرم و بزرگ گردیدہ[2] ۔''

ذکا نے نمونہ کلام میں غالب کے ۲۲ اشعار درج کیے ہیں[3]۔ ان میں اکثر مختلف تذکروں کے حوالے سے اوپر نقل کیے جا چکے ہیں ۔ اس لیے ان کا مکرر نقل کرنا لاحاصل ہے ۔

سعادت خان ناصر نے مرزا نوشہ غالب کے علاوہ مکرم الدولہ بہادر بیگ غالب کا ذکر کیا ہے لیکن یہ ذکر صرف نام ، تخلص اور لقب کی نشان دہی تک محدود ہے ۔ نمونہ کلام میں یہ دو شعر درج کیے ہیں :

مت ہو خفا ، بغل میں گر تجھ کو یار کھینچا
مجبور تھا نشے میں ، بے اختیار کھینچا

قصہ درد و غم اپنا جو سنایا ہم نے
یاں تلک روے کہ اس کو بھی رلایا ہم نے[4]

۱- نسخہ دلکشا مؤلفہ ۱۲۶۸ع حصہ اول صفحہ ۲۶ اور صفحہ ۱۴۷ خطی مسودہ مملوکہ مشفق خواجہ کراچی ۔
۲- عیار الشعرا ، قلمی (فوٹو اسٹیٹ) صفحہ ۲۷۷ مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔
۳- عیار الشعرا ، قلمی (فوٹو اسٹیٹ) صفحہ ۳۷۸ - ۳۷۹ مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔
۴- تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی) صفحہ ۵۸۹ مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔

(۳) غالب تخلص کے ایک اور شاعر انور علی کا ذکر بھی مختلف تذکروں میں ملتا ہے لیکن بہت مختصر گارساں دتاسی نے "سراپا سخن" کے حوالے سے صرف اتنا لکھا ہے :

"وہ نواب جھجھر کے بڑے دوست تھے[۱] ۔"

خود محسن علی محسن مؤلف "سراپا سخن" نے بھی انور علی غالب کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا ۔ بطور نمونہ کلام یہ شعر دیا ہے :

کام تو سو طرح نکل آوے
کوئی جانے تو مدعاے دل[۲]

عبدالغفور نساخ کے تذکرے میں بھی مندرجہ ذیل سطروں کے سوا کچھ نہیں ملتا :

"غالب تخلص ، انور علی نام ، ملازم فیض محمد والی جھجھر ۔"
کام تو سو طرح نکل آوے
کوئی جانے تو مدعاے دل[۳]

مرزا قادر بخش صابر دہلوی نے البتہ اپنے تذکرے میں انور علی غالب کے متعلق بعض تفصیلات دی ہیں ۔ ان کا بیان ہے :

"انور علی ، متوطن پورب ملازم نواب فیض محمد خان والی جھجھر ۔ نوشت و خواند میں ملکہ حسب دل خواہ حاصل تھا اور خوش الحانی میں بے نظیر اور صلاح و تقوی میں بے عدیل ۔ بہ سبب موزونی طبع کے شعر گوئی کی طرف راغب ۔ یہ دو تین شعر اس کے نتائج طبع سے ہیں[۴] ۔"

ایک شعر تو وہی ہے جو اوپر سراپا سخن کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے ۔ باقی دو شعر یہ ہیں :

آہ کیجے کہ نالہ ، وہ پُر فن
نہیں ہوتا ہے آشنا دل کا

۱- تاریخ ادب ہندوستان صفحہ ۱۲۶ ، جلد دوم ، اردو ترجمہ قلمی از لیلیان سسکتان ۔

۲- سراپا سخن صفحہ ۲۸۷ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ع ۔

۳- سخن شعرا صفحہ ۳۴۹ ۔

۴- "گلستان سخن" صفحہ ۳۷۸ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ مملوکہ انجمن ترق اردو ، گلستان سخن صفحہ ۲۵۶ ، مطبوعہ مجلس ترق ادب لاہور جلد دوم ۱۹۶۶ع ۔

ہم تو غالب کے بھی قائل ہیں کہ جا ہی پہنچا
پاس اُس بت کے ، کسی ڈھب ، کسی عیاری سے

(۴) ایک اور شاعر غالب علی خاں غالب کا نام بھی اردو شعرا کی فہرست میں ملتا ہے۔

اعظم الدولہ نے اتنا پتا دیا ہے کہ :

''غالب خاں نبیرۂ دوندی خاں کہ سردارے از قوم افغان بود ازوست''

جاں بلب ہیں تری اس چشم کے بیمار بہت
تیر مژگاں سے ہوئے ہیں جگر افگار بہت[1]

عبدالغفور نساخ کا بیان اس سے بھی مختصر ہے۔ لکھتے ہیں :

''غالب خاں نبیرۂ دوندی خاں باشندہ دہلی بڑے زور آور تھے[2] ۔''

نمونۂ کلام میں وہی ایک شعر جو اوپر سرور کے حوالے سے درج کیا گیا ہے نساخ کے یہاں بھی دیا ہوا ہے۔ کریم الدین اور فیلن صاحب کے تذکرہ میں بھی صرف اتنا لکھا ہے کہ :

''غالب علی خاں نبیرۂ دوندی خاں جو کہ شجاعت میں رستم زماں بلکہ یگانہ ، ساکن رام پور تھے۔ یہ شعر اس کا ہے :

جاں بلب ہیں تری اس چشم کے بیمار بہت
تیر مژگاں سے ہوئے ہیں جگر افگار بہت[3]

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے غالب علی خاں کی توصیف و تعریف میں چند کلمات تو بڑھا دیے ہیں لیکن حالات و نمونہ کلام میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا۔ لکھتے ہیں :

''غالب علی خاں نبیرۂ دوندی خاں است ، در شجاعت و تہور رستم زماں بلکہ در اکثر اوصاف یگانہ ، از روسا نامی و در نظر اولوالابصار گرامی بودہ و اوراست[4]۔''

نمونۂ کلام میں یہاں بھی وہی ایک شعر ملتا ہے جو اوپر مختلف تذکروں کے حوالے سے آ چکا ہے۔ جنم جی متر ارمان نے بھی ان کا نام لے کر وہی اوپر کا شعر

۱- عمدۂ منتخبہ صفحہ ۳۵۲ -
۲- سخن شعرا صفحہ ۳۴۹ -
۳- طبقات الشعرا صفحہ ۳۹۳ -
۴- گلشن بے خار صفحہ ۱۳۹ -

درج کر دیا ہے[1] ۔ ذکا نے بھی ایک سطر لکھ کر نمونے میں محولہ بالا ایک شعر دے دیا ہے[2] ۔ گارساں دتاسی نے کریم‌الدین کے حوالے سے صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کیا ہے ۔

"وہ افغان سردار دونذی خان کے پوتے تھے[3] ۔"

قطب‌الدین باطن نے دو سطریں غالب کی تعریف میں لکھی ہیں ۔ اس میں بھی کوئی نئی معلومات نہیں ہے ۔ نمونۂ کلام میں بھی وہی ایک شعر جو اوپر نظر سے گذر چکا ہے ، ملتا ہے[4] ۔

اشپرنگر نے بھی گارساں دتاسی کی طرح صرف ایک جملہ لکھا ہے :

"غالب خان افغان سردار دونذی خان کے پوتے تھے ۔"[5]

غالب علی خان غالب کے حالات زندگی اس سے زیادہ کسی اور تذکرے میں نہیں ملتے ۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی صاحب ان کے مزید حالات و کلام کا سراغ لگائیں ۔

۵- عبدالغفور خاں نساخ نے عظیم آباد کے ایک شاعر مرزا امان علی غالب کا ذکر بھی اپنے تذکرے میں کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"مرزا امان علی خاں عظیم آبادی مؤلف اردو قصہ حمزہ شاگرد قتیل ، مدت تک ڈپٹی کلکٹر تھے ۔ بہت دنوں تک کلکتہ میں سکونت اختیار کی ۔ شعر فارسی میں بھی کہتے ہیں ۔ پہلے قوم ہندو سے تھے ، پھر مشرف بہ اسلام ہوئے[6] ۔"

نمونۂ کلام میں نساخ نے مندرجہ ذیل شعر دیے ہیں :

بن گئے لعل و گہر اشک دل افگاروں کے
دیدۂ زار چرانے ہوئے فواروں کے

آئنے میں آپ نے جو دیکھا روئے آتشیں
پڑ گئیں چنگاریاں گویا سراسر آب میں

۱- نسخۂ دلکشا صفحہ ۱۷۵ ۔
۲- عیار الشعرا قلمی فوٹو اسٹیٹ صفحہ ۴۸۹ ۔
۳- تاریخ ادب ہندوستانی جلد دوم صفحہ ۱۲۶ اردو ترجمہ قلمی ۔
۴- گلستان بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب صفحہ ۱۷۱ ۔
۵- یاد گار شعرا صفحہ ۱۴۸ ۔
۶- سخن شعرا صفحہ ۳۵۰ ۔

خنجر مژگاں کی دکھلا آج بڑانی مجھے
آئنہ تجھ کو دکھانے چشم حیرانی مجھے
سلطنت سے ہے کہیں غالب میسر ہو اگر
آستان سرورِ عالم کی دربانی مجھے

گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ :

''نواب مرزا امین علی[1] خان بہادر لکھنوی - شیفتہ کے بقول انھوں نے قصہ امیر حمزہ کو فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا جو حال میں کلکتہ سے شائع ہوا ہے[2]۔''

اس بیان میں شیفتہ کا حوالہ غلط معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ گلشن بے خار میں امان علی خان غالب کے نام سے کسی شاعر کا ذکر نہیں ہے -

بھٹ چاریہ کا بیان ہے کہ :

''نواب امان علی خان غالب ، باشندے عظیم آباد کے ، چند مدت سے کلکتے آ رہے ہیں[3] -''

نمونہ کلام میں سخن شعرا کے آخری دو شعر درج ہیں -

(۶) اُردو شعرا کے تذکروں میں ایک ایسے شاعر کا ذکر بھی ملتا ہے جو نام اور تخلص دونوں لحاظ سے مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب سے بہت مشابہ ہے ، یعنی ان کا نام بھی اسد اللہ خان اور تخلص غالب ہے - یہ بھی دہلی کے رہنے والے تھے اور اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے - مرزا نوشہ کے علاوہ اسد اللہ خان غالب دہلوی کے متعلق مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب نے میر مہدی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ :

''وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط ، میرے نام کا ، میرے ہم نام کے ہاتھ جا پڑا - صاحب ! قصور تمھارا ہے ، کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو - مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں ، نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا نہ کوئی اپنا ہم طرف بننے دیا ، نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا[4] -''

۱- امان علی خان ہونا چاہیے تھا (ف) -
۲- تاریخ ادب ہندوستانی اُردو ترجمہ جلد دوم -
۳- نسخہ دلکشا ۱۶۳ -
۴- خطوط غالب صفحہ ۲۹۲ ، مرتبہ مالک رام ، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ ۶۳-۱۹۶۲ء -

لیکن اُن کا یہ خیال صحیح نہیں ہے - دلی میں غالب تخلص کے کئی شاعر گذرے ہیں -

گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ :

''وہ دہلی سے ترک وطن کرکے نواب مہابت جنگ کے دور حکومت میں مرشد آباد چلے گئے تھے - وہ اپنی فیاضی اور دوسری خوبیوں کے لیے مشہور تھے - شعر و سخن کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے اُردو فارسی دونوں میں کثرت سے اشعار کہے ہیں - کہا جاتا ہے کہ علی ابراہیم کے ساتھ بہ حیثیت معتمد کام کرتے تھے - بینی نرائن نے ان کی تین غزلیں نقل کی ہیں[1] -''

یہاں گارساں دتاسی نے اسد اللہ خاں غالب اور بہادر بیگ خاں بیگ کے حالات کو گڈ مڈ کر دیا ہے - اسد اللہ خاں غالب کے بارے میں بینی نرائن کا حوالہ غلط ہے - بینی نرائن نے اسد اللہ خاں غالب کا ذکر ہی نہیں کیا - ان کے یہاں صرف بہادر بیگ خاں غالب کا ذکر ہے اور انہیں کی تین غزلیں انھوں نے نقل کی ہیں[2] - یہ غزلیں ہم بہادر بیگ خاں بیگ غالب کے ذکر میں درج کر چکے ہیں -

گارساں دتاسی کا بیان علی ابراہیم سے ماخوذ ہے اور علی ابراہیم کی اصل عبارت یہ ہے :

''غالب دہلوی مخاطب بہ سیدالملک نواب اسد اللہ خاں بہادر امام جنگ در زمان دولت نواب صابت جنگ وارد مرشد آباد شدہ - سکونت در آن بلدہ اختیار نرمودہ - در فتوت و مروت یگانہ و در اخلاق و استقامت حال ممتاز عصر اند - اگرچہ شاعری دون مرتبہ کمال آن ستودہ خصال است اما گاہے بہ موزونی طبع بہ نظم شعر فارسی و ریختہ رغبت می نماید - خاکسار را بخدمت آن سید عالی تبار نیاز مندی است -''

عجب کیا ہے اگر اخگر گریں اب میری آنکھوں سے
کہ روتا ہے دل پر شور آتش بار پہلو میں[3]

۱- تاریخ ادب ہندوستانی جلد دوم اُردو ترجمہ صفحہ ۱۱۹ -
۲- دیوان جہاں صفحہ ۱۲۸ -
۳- گلزار ابراہیم صفحہ ۱۸۲ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء -

عبدالغفور نساخ نے صرف اتنی اطلاع دی ہے کہ :

''اسد اللہ خاں دہلوی نے صابت جنگ کے عہد میں مرشد آباد میں سکونت کی تھی[۱]۔''

نمونہ' کلام میں وہی ایک شعر درج ہے جو گلزار ابراہیم کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے ۔

اشپرنگر نے عشقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ :

''نواب اسداللہ خاں غالب دہلوی کچھ عرصے مرشد آباد میں رہے اور علی ابراہیم سے ملے تھے ۔ کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے[۲]۔''

عشقی کا اصل بیان یہ ہے :

''غالب تخلص دہلوی الملقب نواب اسداللہ خاں بہادر مردے خلیق و صاحب ہمت بودے ۔ گویند کہ در عہد صوبہ داری نواب صابت جنگ بہادر از دہلی وارد مرشد آباد گردیدہ ۔ مدتے در آنجا طرح استقامت انداخت گاہ گاہ بہ نظم فارسی نیز پرداخت[۳]۔''

نمونہ' کلام میں وہی ایک شعر جو مندرجہ بالا تذکروں کے حوالے سے درج کیا جا چکا ہے ، عشقی کے یہاں بھی ملتا ہے ۔

مردان علی خاں مبتلا لکھنوی نے بھی اپنے تذکرے میں کوئی تفصیل نہیں دی ۔ بس اتنا لکھا ہے کہ :

''غالب تخلص نواب اسداللہ خاں سید الملک از عہد دولت نواب مہابت جنگ در بلدہ مرشد آباد استقامت دارد ۔ سید بزرگ مرتبت با فتوت و مروت است ۔ در فن طبابت نیز ماہر ، گاہے بہ موزونی طبع انشائے شعر ریختہ می کند ، ازوست[۴]۔''

''عجب کیا ہے اگر اخگر گریں اب تیری آنکھوں سے
کہ روتا ہے دل پر شور آتش بار پہلو میں''

(۷) منشی امیر مینائی نے غالب تخلص کے ایک اور شاعر کا سراغ اپنے

۱- سخن شعرا صفحہ ۳۴۹ ۔
۲- یادگار شعرا صفحہ ۱۴۷-۱۴۸ ۔
۳- تذکرۂ عشقی مشمولہ دو تذکرے جلد دوم مرتبہ کلیم‌الدین احمد مطبوعہ پٹنہ ۔
۴- گلشن سخن صفحہ ۱۷۸ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۶۵ع مملوکہ قیصر ابن حسن ۔

تذکرے میں دیا ہے - لکھتے ہے :

''غالب حکیم محمد خاں ولد محمد اعظم خاں ، مرد خوش مذاق ، شاگرد غلام رسول خاں مشتاق ، ستر برس کی عمر پائی - رجب کی گیارہویں کو ۱۲۷۹ھ میں قضا کی - یہ دو شعر ان کے استاد کو یاد تھے'':

راہ جب دل میں ہو کوئی نہیں مانع ہوتا
سینکڑوں ڈھب ہیں اگر چاہیں وہ آنے کے لیے

بٹی کسی نے ان کو پڑھائی تھی ایسی رات
بولے نہ پاس میرے چپھرکھٹ کے سوا[1]

(۸) گارساں دتاسی نے تاریخ ادب ہندوستانی میں غالب تخلص کے ایک ہندو شاعر لالہ موہن لال کا ذکر بھی کیا ہے لیکن صرف اس قدر کہ وہ آگرہ کے ایک کائستھ ہیں - ریختہ اور فارسی میں شعر کہتے تھے - ذکا نے ان کا ذکر کیا ہے[2]-

خوب چند ذکا کے یہاں موہن لال غالب کا ذکر اس طور پر آیا ہے -

''لالہ موہن لال غالب تخلص ، قوم کایستھ سکسینہ ساکن اکبر آباد شاعر فارسی و ہندی -''

ذکا نے موہن لال غالب کے نمونۂ کلام میں ۱۹ اشعار درج کیے ہیں[3] : ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ موہن لال غالب ایک ریختہ گو قادرالکلام شاعر تھے -

سخن میں دل مرا گر خوں نہ ہوتا
تو رنگیں اس قدر مضموں نہ ہوتا
لڑاتا دو بدو آنکھ اس سے غالب
نظر میں اس کی گر جادو نہ ہوتا

پرکار کی روش سے بہت ہم رواں چلے
پر گردش فلک سے نہ نکلے جہاں چلے

۱- یادگار انتخاب صفحہ ۶۳ - ۶۴ مطبوعہ ۱۲۹۷ھ تاج المطابع رام پور -
۲- تاریخ ادب ہندوستانی جلد دوم اردو ترجمہ صفحہ ۱۲۶ -
۳- عیارالشعرا صفحہ ۳۸۳ -

اے بلبلو ! گلوں سے یہاں اپنے خوش رہو
ہم طوطیِ چمن تھے جہاں کے وہاں چلے

چمن لالہ سے خوں ہوتا ہے صحرا خوں اڑاتا ہے
جنوں سے جس گھڑی سینہ ہم اپنا چاک کرتے ہیں

شالہ سے ملا زلف گرہ گیر کسی نے
پہنائی پھر آخر مجھے زنجیر کسی نے
کیوں کر ہے خون جگر اشک ہمارا
اس طفل کو اب تک نہ دیا شیر کسی نے
آج آیا ہے گلشن میں کوئی خون کا پیاسا
غنچوں کی رکھی لخت جگر چیر کسی نے
تو خاک ہوا ہے جو رہ عشق میں غالب
بتلائی ہے نادر تجھے اکسیر کسی نے

مجسس میں بتِ نا آشنا کی
عجب آئی نظر قدرت خدا کی

چشم نم آہ بلب چاک گریباں سے ہم
اے جنوں خوب چلے سیرِ بیاباں سے ہم

گر نہ دیکھے تو اسے جرم ترا ہے غالب
ورنہ اس کی تو کبھی جلوہ نما' نہ گئی

شعلہ رو باغ میں جس وقت نکل جاتے ہیں
دیکھ کر لالہ و گل ، رشک سے جل جاتے ہیں
دعویٰ' خون سے آن کو جو نہیں ہے سرو برگ
کس لیے برگ حنا ہاتھ سے مل جاتے ہیں

اے نظر سیل سرشک آج بہانے دے مجھے
مردم چشم کو دریا میں ڈوبانے دے مجھے
اس کی زلفوں سے ہوا دیکھ کے سودا برپا
اے جنوں وقت ہے زنجیر ہلانے دے مجھے
گلشن حسن میں دو پھل ہیں ترے سینے پر
پر یہ پھل ہے جونکاک ہاتھ لگانے دے مجھے
اے دل اب جوش جنوں نے تو گریباں پکڑا
دھجیاں چاک گریباں کی اڑانے دے مجھے

کچھ خبر کوچۂ دلدار کی پائی نہ گئی
جو گیا اس کی طرف پھر خبر آئی نہ گئی
گرچہ غیروں نے قسم مجھ‌کو دلائی لاکھوں
پر قسم ہے کہ قسم آپ کی کھائی نہ گئی[۱]

اشپرنگر کے بیان سے بھی موہن لال غالب کے حالات زندگی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی - وہ صرف اتنا لکھتے ہیں کہ :

''لالہ موہن لال غالب آگرہ کے کائیستھ ہیں اور فارسی اور ریختہ میں شعر کہتے ہیں -[۲]''

(۹) قدیم دکنی شعرا کی فہرست میں بھی غالب تخلص کا ایک شاعر ملتا ہے - گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ :

''دکن کے ایک شاعر ہیں اور ولی کے ہم عصر ہیں -[۳]''

کریم الدین نے لکھا ہے کہ :

''غالب ایک شخص باشندۂ دکن کا تخلص ہے جو کہ ہم عصر ولی کا ہے یہ شعر اس کا ہے :

غالب کے خون چشم سے آلودہ کیا کریں
وہ پاؤں جو حنا سے رہے سر گراں سدا[۴]''

۱- عیار الشعرا صفحہ ۳۸۴-۳۸۵ -
۲- یادگار شعرا صفحہ ۱۴۸ -
۳- تاریخ ادب ہندوستانی اردو ترجمہ قلمی جلد دوم صفحہ ۱۲۵ -
۴- طبقات الشعرا صفحہ ۱۱۴ -

درگا پرشاد نادر بھی صرف اتنی خبر دیتے ہیں کہ :

''غالب کوئی شخص ولی کا ہم عصر دکنی یوں گویا تھا'' :

غالب کے خون چشم سے آلودہ کیا کریں
وہ پاؤں جو حنا سے رہے سر گراں سدا[۱]

(۱۰) درگا پرشاد کے یہاں غالب تخلص کے ایک اور شاعر کا تذکرہ ملتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

''غالب حاجی میاں ، بڑودہ کا سید ، مہاراجہ کا قدیمی نوکر ، سرگروہ وہابیہ ، ہیضہ کرکے جوانی ہی میں بعد ختم ہونے اصلی کتاب کے مر گیا۔ یہ بیت اس کی ہے :

چاند تک دکھلا کے سمجھاؤں پہ کیا صورت کروں
مانگتا ہے طفل دل ہٹ کرکے اس کی ہی شبیہ[۲]

بالکل یہی الفاظ بہاء الدین بشیر نے دہرا دیے ہیں اور وہی ایک شعر درج کیا ہے جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ صرف اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس میں حاجی میاں غالب کا سال وفات ۱۲۶۸ھ دیا ہوا ہے[۳]۔

قاضی نور الدین فائق نے البتہ حاجی میاں غالب کے متعلق کچھ وضاحت سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

''غالب تخلص سید حاجی میاں از سادات بروده مرد خوش مزاج و حمید اطوار و از آبا و اجداد خود داخل زمرہ ملازمان مہاراجہ گائیکوار است۔ اکثر طبعش مائل مناقب مرتضوی است ، از فکر کردہ اوست ۔''

زلف میں اور پریشان ہوا دل اپنا
کب سنبھلتے ہیں سنبھالے سے جو دیوانے ہیں

چاند تک دکھلا کے سمجھاؤں پہ کیا صورت کروں
مانگتا ہے طفل دل ہٹ کرکے اس کی ہی شبیہ[۴]

۱۔ خزینۃ العلوم فی المتعلقات المنظوم طبع اول مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ، مملوکہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو کراچی ۔

۲۔ خزینۃ العلوم مطبوعہ ۱۸۷۹ع مطابق ۱۲۹۶ھ طبع اول مفید عام پریس لاہور ۔ مخزونہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو کراچی ۔

۳۔ تذکرہ بہاء الدین بشیر ، مسودہ قلمی مملوکہ مشفق خواجہ کراچی ۔

۴۔ مخزن شعرا صفحہ ۷۹-۸۰ مرتبہ مولوی عبدالحق مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۳ع ۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ غالب تخلص کے متعدد شعرا
اردو میں گذرے ہیں ۔ ان میں سے بعض غالب کے معاصر تھے اور اردو فارسی دونوں
میں نہایت اچھا کہتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تذکرہ نگاروں نے ایک کے
اشعار غلطی سے دوسرے کے نام منسوب کر دیے ہیں ۔ ہم نے زیر نظر مضمون
میں صرف اردو شعرا کے تذکروں کی مدد سے غالب تخلص رکھنے والے اردو شعرا
کے حالات اور اشعار کا سراغ لگانے اور انھیں یک جا کرنے کی کوشش کی ہے ۔
ضرورت اس کی ہے کہ ایک الگ مضمون کے ذریعہ اسد تخلص کے اردو شعرا کی
زندگی اور کلام کا پتا چلایا جائے ۔ اسی طرح فارسی شعرا کے تذکروں کی مدد
سے غالب اور اسد تخلص کے شاعروں کا الگ الگ جائزہ لیا جائے ۔ یقین ہے کہ
اس انداز سے کام کرنے کے بعد مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب کی زندگی اور کلام
دونوں کے متعلق بعض نئی باتیں سامنے آئیں گی اور تحقیق و تنقید کے باب میں
اہم ثابت ہوں گی ۔

سعادت علی صدیقی

یادگار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری میں غالب کے بعض اشعار

مولانا حالی، مرزا غالب کے عزیز شاگرد بھی تھے اور ان کے پہلے سوانح نگار بھی ۔ ان کی کتاب یادگار غالب ، غالب شناسی کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور بعض اعتبارات سے آج بھی اس کی بے مثالی پر حرف نہیں آیا ہے ۔ تشریح شعری کے فن میں اس کتاب کا وہ حصہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے جس میں غالب کے اشعار کے لفظی و معنوی محاسن پر مولانا حالی نے روشنی ڈالی ہے ۔ لیکن ایک عجیب بات جس کی طرف ابھی توجہ نہیں کی گئی ہے یہ ہے کہ یادگار غالب میں حالی نے غالب کے جو اشعار درج کیے ہیں ، ان میں سے اکثر اشعار کا متن ، آج کے مستند نسخوں میں موجود متن سے خاصا مختلف نظر آتا ہے ۔ اگر اس پر نظر رہے کہ حالی کو کلام غالب کے ترتیبی مطالعے کا اتفاق رہا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ شعر انھوں نے خود غالب کی زبان سے سنے ہوں اور کلام غالب کے ان خطی اور مطبوعہ نسخوں پر بھی ان کی نظر ہو ، جو اس کتاب کی تصنیف کے وقت تک منظر عام پر آ چکے تھے ، تو اس اختلاف کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔

متن کی ترتیب و تنقید کے جو مسائل ہیں ، ان میں ایک نہایت اہم مسئلہ اختلاف متن اور اس کے وجوہ کا تعین بھی ہے ۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو یادگار غالب میں درج ایسے مختلف المتن اشعار کی اہمیت نمایاں ہو جاتی ہے ۔ آزاد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد ذوق کے کلام کو جب مرتب کیا تو اس میں جگہ جگہ لفظی تصرفات کرتے گئے ۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں اس طرح درج ہے :

گل بھلا کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے [1]

۱۔ دیوان ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد طبع اول صفحہ ۲۸۳ ۔

لیکن دیوان ذوق مرتبہ ویران و ظہیر میں اس کی یہ صورت ہے :

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے[1]

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے مرتبہ کلیات ذوق میں دیوان ویران کے متن کو ترجیح دی ہے اور اس کی تہ میں غالباً یہی خیال کارفرما ہے کہ دوسری صورت ، آزاد کی تراشیدہ ہے ۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آزاد نے خود لفظی تبدیلی کی یا انھوں نے کبھی ذوق کی زبان ہی سے اسی طرح سنا ہو یا ان کے پیش نظر ایسی کوئی تحریر تھی جس میں ذوق کی یہ اصلاح شدہ صورت ہو اور وہ تحریر دوسروں کے سامنے نہ ہو ۔ بہر صورت ایسے عصری اختلافات اہم اور قابل ذکر سمجھے جاتے ہیں ۔

کبھی کبھی ساعت یا جس چیز کو مذاق سلیم یا خوش مذاقی کہا جاتا ہے اور جو دراصل انسان کی ذاتی پسند و ناپسند کا دوسرا نام ہے ۔ اس کی کرشمہ کاریاں بھی ایسے اختلافات کی ذمہ دار ہوتی ہیں ۔ مولانا حالی کو مرزا غالب سے جو ربط خاص تھا ، وہ جس قدر ان کے قریب تھے اور کلام غالب سے ان کو تعلق خاطر تھا ، ان سب کی بنا پر ، ان کے درج کردہ اشعار کے متن کو بھی اہمیت حاصل ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ ان اختلافات کو ترجیح نہ دی جا سکے اور اصل متن کا درجہ انھیں حاصل نہ ہو سکے ، لیکن تنقید و ترتیب متن کے اصولوں کے تحت ان اختلافات کا تذکرہ ضروری ہوگا ۔

اسی نقطۂ نظر سے ذیل میں ان اختلافات کو پیش کیا جا رہا ہے ۔ یادگار غالب پہلی بار ۱۸۹۷ع میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی تھی ۔ میں نے اسی ایڈیشن کو بنیاد بنایا ہے اور دیوان غالب کے نسخۂ عرشی (طبع اول ۱۹۵۸ع) کو پیش نظر رکھا ہے ۔ مالک رام صاحب نے ابھی دیوان غالب ، نسخہ نظامی پریس کانپور کو شائع کیا ہے جو جون ۱۸۶۲ع میں غالب کی تصحیح کے بعد چھپا تھا اور جس کے متعلق مالک رام صاحب نے لکھا ہے :

"مطبع نظامی کے نسخے میں غالب کا سب سے آخری صحیح کردہ متن ہے ۔ اس میں کلام بھی سب سے زیادہ ہے ۔ اسی لیے یہی نسخہ غالب کی صد سالہ یادگار کے موقع پر پیش کیا جا رہا ہے[2]۔"

اسی نسخے کو پیش نظر رکھا ہے اور اختلافات کی صورت میں اس کی نشان دہی بھی کر دی ہے ۔

مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں بھی غالب کے کچھ اشعار پیش کیے ہیں ۔ آخر مضمون میں ایسے اشعار کو شامل کر دیا گیا ہے ، جن کے متن میں اختلاف ہے ۔ اس طرح یہ مضمون مولانا حالی کی دو تصانیف میں غالب کے اشعار کے متن اور دیوان غالب کے ان دو مصدقہ نسخوں کے اختلافات پر مبنی ہے ۔

۱- دیوان ذوق مرتبہ ویران صفحہ ۱۳۹ ، کلیات ذوق مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صفحہ ۳۹۹ ۔

۲- دیوان غالب مرتبہ مالک رام صدی ایڈیشن ۱۹۶۹ع صفحہ ۳ ، ۴ ۔

یادگار غالب	صفحہ
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور	۳۷
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے	۳۷
نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب	۳۷
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید	۱۰۲
گویا صحرا غبار دامن دیوانہ تھا	۱۱۰
شب خمار چشم ساقی رست خیز اندازہ تھا	۱۱۱
بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا	۱۲۰
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں	۱۲۴
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے	۱۲۵
ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم	۱۳۲
کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں	۱۳۷
نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر	۱۴۰
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا	۱۴۰
غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو	۱۴۰
شایان دست و بازوے قاتل نہیں رہا	۱۴۲
جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا	۱۴۲
یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات	۱۴۴
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں	۱۴۸
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں	۱۵۰
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ	۱۵۰
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے	۱۵۱
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں	۱۵۲

دیوان غالب نسخۂ عرشی	صفحہ
مانا کہ ہمیشہ نہیں ، اچھا کوئی دن اور	۱۷۰
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے	۱۷۱
ناداں ہو ، جو کہتے ہو کہ ''کیوں جیتے ہیں غالب ؟''	۱۷۱
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید	۱۸۷
تو کہے ، صحرا غبار دامن دیوانہ تھا	۲۵
شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا	۱۳۶
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	۱۵۰
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں	۱۹۲
ساغر جم سے ، مرا جام سفال ، اچھا ہے	۲۳۹
ترے سرو قامت سے ، یک قد آدم	۱۷۹[1]
کرتا ہے ، بسکہ باغ میں تو ، بے حجابیاں	۲۰۶
نہ مارا جان کر بے جرم ، غافل تیری گردن پر	۱۳۶
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا	۱۶۲
غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو	۱۳۷
شایان دست و خنجر قاتل نہیں رہا	۱۵۳[2]
جہاں ساقی ہو تو ، باطل ہے دعوئ ہوشیاری کا	۱۳۸
یا رب ، وہ نہ سمجھے ہیں ، نہ سمجھیں گے مری بات	۱۷۰
قاصد کے آتے آتے ، خط ایک اور لکھ رکھوں	۱۸۸[3]
ہر یک سے پوچھتا ہوں کہ ''جاؤں کدھر کو میں؟''	۱۹۰[4]
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ	۱۹۰[5]
وہ آئے گھر میں ہمارے ، خدا کی قدرت ہے	۱۸۷
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں	۱۹۱

۱- ''ترے سرو قامت سے اک قد آدم'' دیوان غالب مرتبہ مالک رام ، صدی ایڈیشن صفحہ ۷۸ -

۲- شایان دست و بازوے قاتل نہیں رہا : دیوان غالب مرتبہ مالک رام صفحہ ۳۹ -

۳- قاصد کے آتے آتے ، خط اک اور لکھ رکھوں ،، ،، ،، ،، صفحہ ۷۸

۴- ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ ''جاؤں کدھر کو میں'' ،، ،، ،، ،، ،، ۸۱

۵- چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ ،، ،، ،، ،، ۸۲

ہوں منحرف نہ کیوں رہ رسم صواب سے ۱۵۳
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو ۱۵۴
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب ۱۵۶
تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی ۱۵۶
اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل ۱۵۷
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ۱۵۹
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے ۱۵۹
پلا دے اوک سے ساقی جو منھ (؟) سے نفرت ہے ۱۶۱
ہائے وہاں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا ۱۶۲
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے ۱۶۲
دھوے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے ۱۶۳
روک دو گر غلط چلے کوئی ۱۶۴
ڈھانک لو گر خطا کرے کوئی ۱۶۴
بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا ۱۶۴
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھ کو ۱۶۶
دیا ہے اور کو بھی تا اسے نظر نہ لگے ۱۶۷
زمانہ عہد میں ہے اس کے محو آرایش ۱۶۷
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوے سلام ۱۷۰
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں ۱۷۰
روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے ۱۷۱
بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جم جاہ نے دال ۱۷۲
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر }
جسم رکھتا ہوں ، ہے اگرچہ نزار } ۱۶۸
میری تنخواہ میں تہائی کا ۱۶۹

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے ۱۹۷
لیکن ، خدا کرے ، وہ ترا جلوہ گاہ ہو ۱۹۷
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری ، غالب ۲۳۴
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی ۲۳۳
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن ، بعدِ قتل ۲۳۶
دل کے خوش رکھنے کو ، غالب ، یہ خیال اچھا ہے ۲۴۰
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا ، تو پھر لہو کیا ہے ۲۴۲
پلا دے اوک سے ، ساقی ، جو ہم سے نفرت ہے ۲۲۳
وائے ! واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا ۲۳۲
وہ نیشتر سہی ، پر دل میں جب اتر جاوے ۲۴۸
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے[1] ۲۲۹
روک لو ، گر غلط چلے کوئی ۲۴۲
بخش دو ، گر خطا کرے کوئی ۲۴۲
بھرم کھل جائے ، ظالم تیرے قامت کی درازی کا ۲۴۹
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ، ورنہ ۲۴۵
دیا ہے خلق کو بھی ، تا اسے نظر نہ لگے ۲۳۶
زمانہ ، عہد میں اس کے ، ہے محو آرایش ۲۳۶
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں ، کرتے ہوئے سلام ۱۲۹
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں ۱۲۹
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے ؟ ۱۲۸
بھیجی ہے جو ، مجھ کو شاہِ جم جاہ نے ، دال ۲۵۴

کچھ تو جاڑے میں چاہیے ، آخر
تا نہ دے ، باد زمہریر، آزاد
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش ؟ ۱۲۶
جسم رکھتا ہوں ، ہے اگرچہ نزار

میری تنخواہ میں چہارم کا ۱۲۶

۱- دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے : دیوان غالب مرتبہ مالک رام صفحہ ۱۶۴ -

مقدمہ شعر و شاعری[1]	صفحہ
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے	۳۹
ان کے آنے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر	۴۰
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں	۹۳
زمانہ عہد میں ہے اس کی محو آرایش	۱۳۹
جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس رنگ میں جو آئے	۱۵۷
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے	۱۶۸

۱- مقدمہ شعر و شاعری : حالی ، مطبع انصاری دہلی مطبوعہ ۱۸۹۳ع -

دیوان غالب نسخہ عرشی[1]	صفحہ
ساغر جم سے ، مرا جام سفال اچھا ہے	۲۳۹
ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر[2]	۲۳۹
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں	۱۹۲
زمانہ ، عہد میں اس کے ہے محو آرایش	۲۳۶
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے ، جس بھیس میں جو آئے	۲۳۹
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے	۲۲۹

۱- دیوان غالب : نسخہ عرشی ، انجمن ترقی اردو ، ۱۹۵۸ء -
۲- ان کے دیکھے سے جو ، آ جاتی ہے منہ پر رونق : دیوان غالب مرتبہ مالک رام صدی ایڈیشن صفحہ ۱۳۸ -

ڈاکٹر گیان چند

غالب کے نقاد

غالب کے انتقال کو ایک صدی ہو رہی ہے ۔ غالب ان دیدہوروں میں تھے جو اپنے زمانے سے آگے جھانک لیتے ہیں ۔ ان کی شاعری اُنیسویں صدی کے لیے نہیں ، بیسویں صدی کے لیے تھی ۔ ان کے فکر کی اڑان ان کے ابنائے عصر سے بالا تر تھی ۔ ان کے سننے والے ان کے جوہرِ اندیشہ کی گرفت نہ کر سکتے تھے ۔ اس لیے غالب کو زندگی بھر یہ شکوہ رہا کہ ان کے کمال کی خاطر خواہ قدر نہ ہوئی ۔ اس موقع پر یہ غلط فہمی ذہن سے دور کر دینی چاہیے کہ غالب کو ان کے عہد میں کوئی اہمیت نہ دی گئی ۔ ذوق اور مومن کے ساتھ غالب کو دلی کے تین بڑے شاعروں میں سمجھا جاتا تھا لیکن ان کے عہد کی بدمذاقی یہ تھی کہ دلی میں ذوق کو اور لکھنو میں ناسخ کو ان پر فوقیت دی جاتی تھی ۔ آزاد نے آب حیات میں ذوق کے نام پر ملک الشعرائی کا سکہ موزوں کر دیا جیسے وہی مسند نشیں بارگاہ شعر ہوں اور غالب و مومن محض حاشیہ نشیں ۔ انھوں نے ظاہرا غالب کی کافی مدح کی ہے لیکن آزاد کی بات پر بدگمانی ہوتی ہے کہ کہیں مدح کے پردے میں ہجو ملیح تو نہیں کر رہے ، مثلاً کہتے ہیں :

''اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے[1] ۔''

''چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں[2] ۔''

اردوے معلی سے محاوروں اور روزمرہ کی مثالیں دے دے کر اعتراض

۱- آب حیات ، صفحہ ۵۱۶ ، بار دوازدہم ، شیخ مبارک علی لاہور ۔
۲- ایضاً ، صفحہ ۵۱۶ ۔

کیا ہے : ''بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے[۱] ۔''

کتنا شاطرانہ جملہ ہے ۔ بہ ظاہر توصیف ہے لیکن مثالیں چن چن کر جن اجنبی محاوروں کی دی ہیں وہ اس بات کے غماز ہیں کہ آزاد نے کمزور فقروں کی تلاش میں کافی فکر کی ہے ؛ مثلاً 'کوئل کی آوامش کا ترک کرنا' 'یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے' ۔ 'نظر اس دستور پر اگر دیکھو' ۔ 'جو آپ پر معلوم ہے مجھ پر مجھول نہ رہے' ۔

تصانیف کے سلسلے میں اردو اور فارسی کی نثری تخلیقات پر خاص طور سے توجہ کی ہے ۔ اردو شاعری کے باب میں خاموشی سے کام لیا ہے ۔ غالب کی تخلیقات پر برائے نام کچھ تبصرہ کیا بھی ہے تو اس میں خلوص کی کمی دکھائی دیتی ہے ۔ آزاد کی جنبہ داری کے رد عمل کے طور پر حالی نے یادگار غالب لکھی جس میں صریحاً یہ اعلان کیا :

''جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے ، اس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے[۲] ۔''

اور یادگار کی اشاعت کے بعد حالی کے فیصلے کو عام طور سے تسلیم کر لیا گیا ۔ یادگار غالب میں سوانح ہے ، شخصیت کا خاکہ ہے اور اردو و فارسی نظم و نثر کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ سوانح کے اعتبار سے یادگار کسی قدر تشنہ ہے لیکن حالی نے کچھ ایسی آنکھوں دیکھی باتیں لکھ دی ہیں جو اور کسی کے ذریعے سے ممکن نہ تھیں ۔ اخلاق و عادات و خیالات کا باب جامع اور مفصل ہے ۔ اس سے غالب کی ایسی دلکش اور عظیم شخصیت سامنے آ جاتی ہے کہ رشید احمد صدیقی کی طرح ہمیں بھی رہ رہ کر یہ ارمان ہوتا ہے کہ کاش ہم اس سے ملے ہوتے ۔

یادگار کا تیسرا حصہ یعنی تنقید بھی کچھ کم اہم نہیں ہے ۔ حالی نے غالب کے رشحات قلم پر چار حصوں میں تنقید کی ہے ؛ اردو نظم ، اردو نثر ، فارسی نظم ، فارسی نثر ۔ اردو شاعری کی تنقید میں اول انھوں نے کچھ خصوصیات گنائی ہیں مثلاً نئی تشبیہیں ، استعارہ و کنایہ ، شوخی و ظرافت ، پہلو دار اشعار ، معنی آفرینی اور جدت ادا وغیرہ ۔ اس کے بعد بڑی تعداد میں مرزا کے منتخب اشعار درج

۱- آب حیات ، صفحہ ۵۱۸ ، بار دوازدہم ، شیخ مبارک علی لاہور ۔

۲- یادگار غالب ، صفحہ ۱۱۵ ، ناشر رائے صاحب لالہ رام دیال اگروال الہ آباد ۱۹۵۸ع ۔

کیے ہیں اور ان کی خوبی کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں - آج جو ہم غالب کے بعض پہلودار اشعار کے لطیف معنوں سے محظوظ ہوتے ہیں ، وہ یادگار ہی کی دین ہے - شاید انھوں نے یہ معانی خود غالب سے سنے ہوں گے - تنقید کا یہ طریقہ کسی قدر فرسودہ ہو سکتا ہے لیکن اس سلجھے ہوئے طریقے سے غالب فہمی میں جتنی مدد ملتی ہے وہ بعد کے نمائشی تبصروں سے نہیں ملتی -

غالب کے خطوط کی جو بنیادی خصوصیات حالی نے گنوا دی ہیں ، میرا خیال ہے کہ ان پر اضافہ نہیں ہو سکا - غالب کی مکتوب نگاری پر کیسے ہی عالمانہ مضامین لکھے جائیں ''یادگار غالب'' کے ڈھانچے ہی پر تعمیر ہوتے ہیں - فارسی نظم و نثر کی تنقید میں بھی حالی نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے - وہاں اضافہ یہ ہے کہ فارسی کے مشاہیر سے موازنہ بھی کرتے ہیں اور دبی زبان سے غالب کو ان سے بڑھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں - اس کا جواب نہیں - حالی ایک عقیدت مند شاگرد تھے ، وہ استاد پر تنقید ہی نہیں لکھ رہے تھے ، اس کو اس کا جائز مقام بھی دلانا چاہتے تھے ، اس لیے وہ جج نہ تھے وکیل تھے - برہان قاطع کے تذکرے میں انھوں نے برہان کے بیانات کو تقریباً ہر جگہ غلط اور غالب کے اعتراضات کو تقریباً ہر جگہ صحیح قرار دیا ہے ، لیکن قاضی عبدالودود کے مضمون ''غالب بحیثیت محقق'' سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے قدیم فارسی کے بیان میں فاحش غلطیاں کی ہیں - حالی نے غالب کی عربی کی استعداد کو بھی کسی قدر بڑھا کر دکھانا چاہا ہے - لکھتے ہیں :

''عربی الفاظ کو اُنھوں نے ہر جگہ اُسی سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے[1] -''

قاضی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ غالب عربی کے معاملے میں بالکل نابلد تھے -

غالب کے نقادوں میں سب سے بلند بانگ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ہیں جن کی ''محاسن کلام غالب'' ۱۹۲۱ع میں شائع ہوئی - یہ تنقید نہیں ، تشریح نہیں ، قصیدہ خوانی ہے ، انشائیہ ہے ، طبل نوازی ہے ، اشتہار ہے ، وکالت ہے اور ان سب کے پردے میں اپنے علم کی بھدی نمائش ہے - مقالے میں جس قماش کی تنقید ہے اس کا نچوڑ پہلے جملے میں آ گیا ہے :

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں : مقدس وید اور دیوان غالب -''

۱- یادگار غالب ، صفحہ ۵۵ ، ناشر رائے صاحب لالہ رام دیال اگروال الہ باد ۱۹۵۸ع -

یہ نثری شعر ہے لیکن معنی سے تہی - یہ کچھ بھی ہو تنقید نہیں ہے - یہ مداحی ہے لیکن غیر مدلل - رامائن ، مہا بھارت ، گیتا ، اپنشد ، کالی داس ، تلسی داس ، سور داس سب کو ڈاکٹر صاحب نے بہ یک جنبش قلم ختم کر دیا - اس وقت تک اہل آردو مغربی ادب سے آشنا نہ تھے - بجنوری مغرب کی کئی زبانوں سے واقف تھے لیکن اس کے باوجود مشرقی روایات سے بیگانہ نہ تھے - اہلِ دربار جس طرح والیان ملک کی بھٹئی کرتے تھے یا اگلے بزرگ جس طرح آنکھ موند کر اپنے سے پہلے کے بزرگوں کی کراماتیں بیان کرتے تھے ، وہی کچھ بجنوری نے غالب کے ساتھ کیا - لطیفہ ملاحظہ ہو - اپنے مقالے کے شروع میں کہتے ہیں :

"تنازع للبقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال و آرا سے کرنے لگے ہیں - یہ وہ غلامی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی - پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانے میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپئر ، ورڈس ورتھ ، ٹینی سن سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں - افسوس یہ کوتاہ نظر نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیسا نادانستہ ظلم ہوتا ہے[۱]" -

اور بجنوری نے یہی کیا ہے اور صرف یہی کیا ہے - فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ غالب کا مقابلہ انگریزی شعرا سے کرتے ہوں گے ، بجنوری نے جرمن ، فرانسیسی ، اطالوی اور خدا معلوم کس کس زبان کے شاعروں سے کیا - آنھوں نے صرف شعرا پر اکتفا نہ کی بلکہ موسیقاروں ، بت تراشوں ، مصوروں اورمفکروں سے بھی غالب کو ٹکرایا اور غالب ہیں کہ ہر بڑے نام کر پیچھے چھوڑ کر عرش سے بھی اُدھر کو پرواز کیے جا رہے ہیں - ڈاکٹر بجنوری نے یورپی شعرا کے اشعار ان کی اصل زبان میں درج کیے اور ستم یہ کیا کہ ان کا ترجمہ درج نہیں کیا - ان کا منشا قارئین کو وہ اشعار سمجھانا تو تھا نہیں - وہ قاری کو مبہوت کرنا چاہتے تھے ، ان زبانوں میں اپنا دخل دکھانا چاہتے تھے -

بجنوری کی تنقید کا ایک منفرد انداز ہے - وہ اکثر ابواب کی ابتدا میں مغربیوں کے اقوال درج کرتے ہیں - ان کی توصیف کرتے ہیں ، اپنی معلومات کی نمائش کرتے ہیں ، فلسفہ بگھارتے ہیں اور نثر میں شاعری کرتے ہیں اور اس دھوم دھاڑ کے کی طویل تشبیب کے بعد آخر میں غالب کے معمولی اشعار کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں - اس عالمانہ انشائیے کے آخر میں غالب کے چند اشعار (مجھے معاف کیا جائے) ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کھودا پہاڑ نکلا چوہا - جیسے اہرام مصر

۱- محاسنِ کلامِ غالب ، صفحہ ۸ ، انجمن ترقی اُردو ہند ، بار پنجم ۱۹۵۸ع -

کو الٹ کر رکھ دیا گیا ہو یعنی پہنائی اوپر اور تنگی سب سے نیچے ۔ جس طرح آریہ ساجی موجودہ دور کی تمام ایجادات کو ویدوں میں تلاش کر لیتے ہیں اسی طرح بجنوری نے قدیم فلسفیوں کی حکمت کا نچوڑ اور جدید سائنس کے تمام اہم انکشافات غالب کے کلام میں ڈھونڈھ نکالے ۔ یہ یقینی ہے کہ بجنوری اگر اپنی کتاب آج لکھتے تو غالب کے اشعار میں 'جوہر' کا لفظ دیکھ کر یہ ضرور ثابت کر دیتے کہ غالب کی نظروں کے سامنے جوہری توانائی اور ہائڈروجن بم کے تمام اسرار و رموز کتاب کشودہ تھے ۔ بجنوری نے تشریح کرتے وقت غالب کے اشعار میں وہ معانی بسا دیے کہ اگر غالب انہیں سنتا تو اسے اپنی شاعری کسی انگلستانی کی شاعری معلوم ہونے لگتی ۔ وہ صرف یہی کہتا کہ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ ۔

بجنوری نے شاعری ، زبان ، حیات اور اس کے مختلف مظاہر کے بارے میں جو فاضلانہ مشاہدات کیے ہیں ان کی بصیرت میں کلام نہیں ، لیکن جب وہ ان سب کا اطلاق غالب کے کلام میں کرنے لگتے ہیں تو ان کے فیصلے کے توازن میں شبہہ ہونے لگتا ہے ۔ انھوں نے غالب کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے ، اس سے اردو ادب کو ایک نیا مقام ملا لیکن انھوں نے مغربی فلسفیوں اور مفکروں کو لے کر جو تمہیدیں درج کی ہیں ان میں اور غالب کے کلام پر تبصرے میں میل نہیں ۔ اس تبصرے سے مغربی مفکروں کے اقوال اور ان پر بجنوری کے مشاہدات کو الگ کر دیا جائے تو ''محاسن کلام غالب'' بہتر کتاب ہو جائے ۔ اس کا طمطراق تو مدھم ہو جائے گا لیکن تنقیدی پایہ بلند ہو جائے گا ۔ فی الوقت تو ''محاسن کلام غالب'' ایک دلچسپ انشائیہ ہے ، نئے رنگ کی تقریظ ہے ، تنقید نہیں ۔ دیوان غالب الہامی کتاب ہو کہ نہ ہو ، ''محاسن کلام غالب'' ضرور تاثراتی تنقید کا آسمانی صحیفہ ہے ۔ جس سخن‌ور پر یہ صحیفہ اترا ہے ، اسے کم از کم اردو والا تو اردو ہی کا نہیں ، تاریخ عالم کا سب سے بڑا شاعر سمجھنے لگا ۔

نظامی بدایونی کے مرتّبہ دیوان غالب کے دیباچے میں سر سید کے صاحبزادے ڈاکٹر سید محمود نے غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار قرار دیا جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ۔ غالب ہمیشہ خود کو وابستگان دولت انگلشیہ ہی سمجھا کیے ۔ انہیں مغل حکومت سے کوئی جذباتی تعلق نہ تھا ۔

مدح و توصیف کے اس غل غپاڑے کا ردعمل ڈاکٹر عبداللطیف کی کتاب 'غالب' کی شکل میں ظاہر ہوا ۔ یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں انگریزی میں شائع ہوئی اور اس کے فوراً بعد اردو میں ۔ ڈاکٹر لطیف نے تحقیق کی انگلی پکڑ کر تنقید کی ہے ۔ بجنوری اور لطیف کی کتابیں غالب کے جائزے کے دو انتہائی نقطے پیش کرتی ہیں ، لیکن اس کے باوجود دونوں میں یک گونہ مشابہت ہے ۔ دونوں

مغرب زدہ ہیں ، دونوں اپنی بات کہنے سے قبل مغربیوں کے اقوال درج کرتے ہیں ۔ دونوں نے اپنے اپنے انداز میں شاعری کی تعریف کی ہے اور پھر اس پیمانے پر غالب کے کلام کو آنکا ہے ۔ ڈاکٹر عبد اللطیف نے ایک محقق کے انداز میں غالب کی سوانح اور شخصیت پر بھی نظر ڈالی ہے ۔ وہ غالب کی شخصیت ، کردار اور اخلاق سے بڑے نا آسودہ ہیں اور شاید یہ ان کی کتاب کا کمزور پہلو قرار دیا جائے گا ۔ غالب کی شاعری پر جس طرح انھوں نے نظر ڈالی ہے ، وہ بادیالنظر میں قائل بھی کرتا ہے اور خلوص سے بھی بھرپور معلوم ہوتا ہے ، لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اتنا معصوم اور منصفانہ نہیں ۔ دوسروں نے اگر غالب کی خامیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلی تھیں تو ڈاکٹر لطیف نے تمام خوبیوں سے انکار کر دیا ہے ۔ انھوں غالب کی شاعری کو محض عقلی اور ذہنی قرار دیا ، نیز ان کی زندگی اور شاعری میں بے اطمینانی کی شدت کو عظمت کے منافی قرار دیا ۔ شاید بجنوری کے جواب میں لطیف کی انتہا پسندی کا جواز مل سکے ۔

ڈاکٹر لطیف غالب کے سنجیدہ معترض ہیں تو 'یاس یگانہ' پھکڑباز دشنام گو ۔ یوں تو وہ اپنی بیشتر تصانیف میں غالب کو کہیں نہ کہیں سے گھسیٹ لاتے ہیں ، لیکن غالب کے خلاف ان کی مستقل تصنیف 'غالب شکن' ہے ۔ اس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ غالب سے ان کی چھیڑ غالب کے خلاف نہیں ، غالب پرستی کے غلو کے خلاف ہے ۔ ان کے طوفان مزخرفات میں یہ جملے رل کر رہ گئے ہیں :

''ڈاکٹر عبد اللطیف کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ غالب کوئی بڑا شاعر نہیں ہے ۔ غالب اردو کا بڑا شاعر ہے ۔ اعلیٰ درجہ کا غزل گو[۱] ۔''

''میں نے ہرگز غالب کا حق تلف نہیں کیا ۔ (ان کو اردو کا مایۂ ناز شاعر جانتا ہوں) ہاں کھری کھری سنا دی جس کے مخاطب غالب نہیں ہیں بلکہ غالب پرست[۲] ۔''

''غالب شکن'' میں کام کی بات ہے تو 'چوریاں یا نقالیاں' والا باب جس میں غالب کے متعدد اشعار کو مشاہیر فارسی سے ماخوذ دکھایا گیا ہے ۔ بیشتر اشعار کی مشابہت اتنی قریبی ہے کہ اس میں شک نہیں رہتا کہ غالب نے دانستہ خوشہ چینی کی ہے ۔

۱- غالب شکن ، از یاس یگانہ ، صفحہ ۲۲ ، طبع ثانی ۱۹۳۵ع ۔
۲- ایضاً ، صفحہ ۳۴ ۔

یگانہ نے جس قسم کے غالب پرستوں پر طنز کیا ہے ، انہیں میں سے ایک غلام رسول مہر ہیں ۔ انھوں نے غالب کے خطوط کی مدد سے بڑی عالمانہ سوانح مرتب کی ۔ یہ تنقیدی کتاب نہیں ، لیکن اس کے سرورق کے اندر نیز اور ایک آدھ جگہ غالب کے نام کے اوپر 'رح' لکھا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ غالب کو اولیا میں سے سمجھتے تھے ۔ انھوں نے ایک باب غالب کے اخلاق و عادات کی تفصیل میں لکھا ہے اور وہاں ان تمام اوصافِ حمیدہ کا ڈھیر لگا دیا ہے ، جو خدا کے برگزیدہ معصوم بندوں ہی میں ہو سکتے ہیں ۔

''یادگار غالب'' کے بعد شیخ محمد اکرام کی 'آثار غالب' ایسی کتاب ہے جو سوانح کی تحقیق کے لیے بھی اہم ہے اور تصانیف کی تنقید کے لیے بھی ۔ اس میں بڑا توازن پایا جاتا ہے ۔ اکرام نے غالب کی ادبی زندگی کے پانچ دور قرار دیے جن میں سے تیسرا دور فارسی کا اور پانچواں دور اردو خطوط کا ہے ۔ ان تمام ادوار کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ۔ اس طرح غالب کا ذہنی ارتقا بھی سامنے آ گیا ۔ اس کے بعد انھوں نے غالب کی شاعری پر عام تبصرہ کیا جو کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے ۔ اس میں غالب کی عشقیہ شاعری ، غالب کے فلسفے اور غالب کے مذہب پر گہری نظر ڈالی ۔ انھوں نے غالب کی عشقیہ شاعری کے بارے میں کئی پتے کی باتیں کہیں ؛ مثلاً یہ کہ زیادہ تر اشعار میں محبت کی خیالی اور رسمی تصویریں ہیں ، یعنی ان کی محبت ذہنی ہے ۔ وہ بجنوری کے اس نظریے سے متفق نہیں کہ غالب کا عشق ہوس سفلہ سے پاک ہے ۔ ان کے نزدیک غالب مصری کی مکھی بن کر جنسی لذت اندوزی کے قائل ہیں ۔ انھوں نے اس نظریے کی بھی تردید کی ہے کہ غالب فلسفی تھا ۔

عام تبصرے کے بعد اکرام نے اردو فارسی کے مشاہیر یعنی میر ، سودا ، مومن ، خسرو ، فیضی اور اقبال سے غالب کا موازنہ کیا ہے ۔ ان میں اشتراک اور اختلاف کے عناصر تلاش کیے ہیں ۔ غالب اور وطنیت کی بحث میں اکرام کی متوازن رائے ہے کہ غالب جدید مفہوم میں وطن پرست نہ تھے ۔ آخری اہم چیز جس کی طرف انھوں نے توجہ دلائی ، غالب اور مغلیہ ذہنیت کی ترجمانی ہے ۔ اکرام کے نزدیک مغل ، نفاست پسندی ، خوش معاشی ، عیش کوشی اور ہموار طبعی کے قائل ہوتے ہیں اور غالب ان اقدار کے بہترین ترجمان تھے ۔ اسی طرح اکرام نے غالب کی شخصیت اور نفسیات کا وسیع پیمانے پر جائزہ لیا ۔ بہ حیثیت مجموعی اکرام کے جائزے سے ہر جگہ تشفی ہوتی ہے ۔

نقدِ غالب کی دو اہم بحثیں ہیں : (۱) غالب پر میر کا اثر ، یعنی میر و غالب

کا موازنہ ۔ (۲) غالب قنوطی تھا یا رجائی ؟ اکرام نے 'غالب نامہ' میں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے 'فلسفۂ کلام غالب' میں میر پر غالب کو ترجیح دی ۔ مرزا اثر لکھنوی معتقد میر ہیں ۔ انھوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب پر تبصرہ کیا جو 'آج کل' دہلی میں نومبر ۱۹۴۸ء اور جنوری فروری ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا ، جس میں انھوں نے غالب پر میر کو ترجیح دی ۔ یہی خیال انھوں نے اپنی کتاب 'مطالعہ' غالب' میں ظاہر کیا ۔ انھوں نے اول تو بہت سے اشعار کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ غالب میر کے خوشہ چیں ہیں ۔ غالب کی کئی مشہور ترکیبیں ان سے پہلے میر کے کلام میں ملتی ہیں ۔ دوسرے یہ کہ شاعری میں میر کا پایہ غالب سے بلند ہے ۔ اثر صاحب نے غالب کی شاعری کو دل سے معرا اور محض دماغ کی پیداوار قرار دیا جس کے برعکس میر کے سوز و گداز پر سر دھنا ۔ ساتھ ہی یہ بھی ثابت کرنا چاہا کہ میر کا غم نشاط کی کیفیت بھی دھار لیتا ہے ۔ شوکت سبزواری نے اپنی کتاب ''غالب ، فکر و فن'' میں اس کا جواب الجواب دیا اور اب کی بار اور شدت سے غالب کو میر پر ترجیح دی ۔ شاید اس بحث میں جناب اثر نے میر پرستی میں کچھ مبالغے سے کام لیا ہے ۔ میر و غالب کے تعلق پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مضمون ''غالب ، معتقد میر'' میں تفصیل سے بحث کی ۔ یہ مضمون نقد غالب میں شامل ہے ۔ ڈاکٹر عبداللہ نے دونوں کا موازنہ کرنے کی بجائے دونوں کے مشترک عناصر کی تلاش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ کلام غالب میں میر کا انداز آخری دور کی شاعری ہی میں نہیں ملتا بلکہ یہ نقوش سارے ادوار کی شاعری میں متواتر ملتے ہیں ۔

اسی سے ملتی جلتی بحث ہے کہ غالب قنوطی تھا یا رجائی ؟ سچ تو یہ ہے کہ غالب کے کلام اور زندگی میں حزن و نشاط کی ایسی دھوپ چھاؤں ملتی ہے کہ دیانت داری سے کوئی بھی رائے قائم کی جا سکتی ہے اور اس میں صحت کا عنصر ہوگا ۔ مشرقی شاعری میں حزنیات کی ہمیشہ قدر کی گئی ہے ۔ انگریزی شاعر شیلی تک نے لکھا ہے کہ ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جو محزون ترین افکار سے بھرے ہوئے ہیں ۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کے اس پہلو کو یہ کہہ کر ہدف اعتراض بنایا :

''غالب کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ تو عطائے رحمانی کا شکر گزار تھا اور نہ انسانی خدمات کا۔[۱]''

۱- غالب ، از عبداللطیف ، صفحہ ۸۰ ، جہاں گیر بک ڈپو ، کھاری باولی دہلی ۔

ان کے برعکس نیاز فتح پوری نے لکھا :

''غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا تو وہ فلسفہ تفاول و مسرت تھا[۱]۔''

شیخ اکرام اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''جمہور بالعموم اس امر پر متفق ہیں کہ غالب کے اشعار میں غم وحزن کی جھلک مسرت و اطمینان سے زیادہ نمایاں ہے[۲]۔''

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا فیصلہ[۳] ہے کہ غالب دراصل نہ قنوطی ہیں ، نہ رجائی ، ارتقائی ہیں ۔ یعنی زندگی میں روز و شب کی طرح شادی و غم بھی گزراں ہیں ۔ ڈاکٹر شوکت شدت و اصرار کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ 'غالب کو قنوطی نہیں کہا جا سکتا ۔' پروفیسر آلِ احمد سرور نے بڑے عمقِ نظر کے ساتھ تجزیہ کیا ہے :

''وہ نہ قنوطی ہیں نہ رجائی . . . . ان کے کلام میں رنج و الم کی جو فراوانی ملتی ہے وہ کہیں تو ان کی ذاتی مایوسیوں کا پرتو ہے اور کہیں محض ایک آلہ خیال . . . ان کی فطرت رجائی تھی ، ان کا ماحول قنوطی۔ انھیں زندگی میں کئی تلخ تجربوں سے دو چار ہونا پڑا تھا ۔ ان کے کلام میں دونوں کی کشمکش ملتی ہے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں[۴] ۔''

اپنے ایک اور مضمون میں سرور صاحب نے پھر یہی دہرایا :

''یہ کہنا غلط ہے کہ غالب فلسفہ مسرت کی تلقین کرتے ہیں ۔ وہ نہ تو قنوطی ہیں نہ رجائی ۔ ہاں ان کے یہاں امید و بیم ، عیش و غم ، آرزو و شکست آرزو ، مسرت و حسرت کی رنگا رنگی ملتی ہے[۵] ۔''

اس دورنگی کا بہترین تجزیہ ممتاز حسین کے اس جملے میں ملتا ہے :

''غالب نشاط کا شاعر تھا ، لیکن اس کے ماحول نے اسے غم کا شاعر بنا دیا[۶]۔''

چند سال پہلے بھوپال کے ادبی حلقوں میں یہ بحث چھڑی تھی جو دو مستقل

۱- بحوالہ غالب نامہ ، از شیخ محمد اکرام ، صفحہ ۳۷ ، احسان بک ڈپو لکھنؤ۔
۲- غالب نامہ ، صفحہ ۳۰۷ ۔
۳- غالب ، فکر و فن ، از شوکت سبزواری ، انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۱ع صفحہ ۱۷۶ ۔
۴- نئے اور پرانے چراغ ، صفحہ ۱۷۶ ۔
۵- غالب کی عظمت مشمولہ نقد غالب ، صفحہ ۱۲۳ ، طبع اول انجمن ترقی اردو ہند ۔
۶- نقد غالب ، صفحہ ۲۰۴ ۔

مضامین میں محفوظ ہوگئی ہے ۔ کوثر چاند پوری اس خصوص میں لطیف سے بھی زیادہ انتہا پسند ہیں ۔ انھوں نے اپنے مضمون 'غالب کا فلسفۂ زندگی' میں دعویٰ کیا ہے :

''غالب نے دنیا کو کسی حیثیت سے بھی مسرت اور اطمینان کی جگہ خیال نہیں کیا ۔ وہ اس سے بیزار اور دل برداشتہ ہی نظر آتے ہیں ۔ کوئی امید اس سے وابستہ نہیں رکھتے[1] ۔''

اسی مضمون کے ردِ عمل کے طور پر ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنا مضمون 'غالب اور فلسفہ' لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں[2] کہ یہ مسلّم کہ حزنیہ یا نشاطیہ اشعار میں ''ایسے شعروں کی تعداد زیادہ ہے جن میں رنج و غم اور یاس و حرماں کا بیان کیا گیا ہے اور ایسے شعر کم ہیں ، جو خوشی اور امید کے آئنہ دار ہیں'' لیکن ''ان کے تصورِ غم میں کسی رجائی فلسفے سے کم قوت و توانائی نہیں . . . . دکھ درد کے فلسفے کے باوجود زندگی ان کی نظر میں تاریک نہیں ہو جاتی ۔''

گویا قنوطیت اور رجائیت کے دوسروں کے درمیان جتنے نقطے اور جتنی منزلیں ہیں ، مختلف نقادوں نے ان سب پر غالب کو جگہ دی ہے : ع

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

کی یہ اچھی مثال ہے ۔ ہر قاری کو اختیار ہے کہ اس بارے میں جو فیصلہ چاہے کر لے ۔ وہ کسی نہ کسی بڑے نقاد کی صحبت میں ہوگا ۔

غالب کے دو دیوان ہیں ۔ ایک متداول ، دوسرا ان کا صحیفۂ منسوخ جس کی ''نسخۂ بھوپال'' کے ذریعے بازیافت ہوئی اور جو پہلے ''نسخۂ حمیدیہ'' میں اور پھر ''نسخۂ عرشی'' کے جزو گنجینۂ معنی میں رونما ہوا ۔ اس کو بھی کئی پر جوش مبلغ اور وکیل ملے ۔ عبدالباری آسی نے اس کے انتخاب کی شرح ''مکمل شرحِ کلام غالب'' (۱۹۳۱ع) کے نام سے لکھی اور اس کے دیباچے میں یہ خیال ظاہر کیا کہ دیوانِ منسوخ متداول دیوان کے برابر نہیں ، اس سے بہتر ہے ۔ کہتے ہیں :

''میرے نزدیک تو یہ وہ کلام ہے جو مرزا کو عوام کی صف میں سے علیحدہ کرکے زمرۂ خواص میں لے آتا ہے اور ان کے تخیل کی رفعت

۱- دیدۂ بینا ، صفحہ ۴۴ ، از حکیم کوثر چاند پوری ، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۳ع ۔

۲- تنقید و تجزیہ از سحر ، صفحہ ۱۲۶ ، کتابستان الہ آباد ۔

کا اندازہ کراتا ہے ۔ ان کی وسعتِ نظر کی شہادت دیتا ہے[1] ۔“

”میں وثوق اور کامل وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غالب کے اس کلام میں وہ جوہر کمال پنہاں ہیں ، جو ہندوستان کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ہیں اور وہ وہ خیالات ہیں کہ اگر وہ جلال اور اسیر اور بیدل کے یہاں ہوتے تو ان کے لیے سرمایۂ نازش ہوتے اور لوگ ان کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے ۔ انھیں مشکل شعروں میں وہ شعر بھی ملے ہوئے ہیں جو ان کے موجودہ دیوان سے کسی طرح کم نہیں ہیں ۔ نہ ان میں کوئی بندش کی خرابی ہے ، نہ تخیل میں کوئی نقص ، نہ بیان میں کوئی عیب ہے[2] ۔“

”باقیاتِ غالب“ کے مصنف وجاہت علی سندیلوی نظری کلام کی مدح و توصیف میں آسی کے نہ صرف ہم نوا اور ہم قدم ہیں بلکہ شاید انھیں پیچھے چھوڑ دیتے ہیں ۔ ان کا رجحان یہ کہنے کا ہے کہ قلم زد کلام متداول کلام سے بہتر ہے ۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

”پوری ذمہ داری سے کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے غیر متداول کلام سے یعنی اس کلام سے کہ جو ان کے منتخب دیوان سے باہر ہے اور جس کو عرف عام میں قلم زدہ سمجھا جاتا ہے ، صرف دس بیس نہیں بلکہ بہت کافی تعداد ایسے اشعار کی پیش کی جا سکتی ہے ، جو ان کے منتخب دیوان کے بہت سے اشعار کے ہم پلہ بلکہ زیادہ تر ان سے اعلیٰ اور ارفع ہیں[3] ۔“

اس سے بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی کہ ان قلم زدہ اشعار کی راکھ میں جو بعض انگارے چھپے رہ گئے تھے وہ قدر و قیمت میں لعلہائے شب تاب سے کم نہیں کہے جا سکتے اور اکثر غالب کے نقشِ اول کو ان کے نقشِ ثانی پر وہ فوقیت حاصل ہے کہ نقشِ ثانی نقشِ اول کو صرف آئینہ دکھاتا رہ جاتا ہے ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی پہلی کوشش میں جس بلندی پر پہنچ جاتا ہے ، بعد کی کوششوں میں وہاں تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے ۔

”غالب کے غیر متداول یا قلم زدہ کلام کو منتخب کرکے دیکھا جائے تو وہ منتخب دیوان کے کلام سے کسی حیثیت سے کم تر یا کم مایہ نہیں ہے . . . اس میں نئے نئے موضوعات کی فراوانی کے ساتھ ہی ساتھ

۱- مکمل شرح کلام غالب ، از آسی ، صدیق بک ڈپو لکھنؤ صفحہ ۱۳ -
۲- ایضاً ، صفحہ ۱۳ -
۳- باقیات غالب ، صفحہ ۴۲ ، از وجاہت علی سندیلوی ، نسیم بک ڈپو لکھنؤ - ۱۹۶۰ع -

صفتِ ایجاد ، جوشِ نگاہ اور انشاطِ تصور کی وہ سرشاریاں اور کرشمہ سازیاں ملتی ہیں کہ مذاقِ سلیم یہ باور کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا کہ ان اشعار میں سے بیشتر دیدہ و دانستہ منتخب دیوان سے خارج کر دیے گئے تھے اور ان کے اخراج میں سہو اور کلام کی کم شدگی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا[۱] ۔"

اردو تنقید میں پیرو پرستی کے قبیل کا ایک رجحان بہت عام ہے جسے میں موضوع پرستی کہوں گا ۔ نقاد کسی موضوع پر ہاتھ ڈالتا ہے تو یہ بیڑا اٹھا لیتا ہے کہ زیرِ مشق قلم شاعر یا تخلیق کو بے عیب اور بے داغ ثابت کرکے رہوں گا ۔ حضرت آسی و سندیلوی کی کتابوں کا موضوع غالب کا قلم زد دیوان ہے ۔ لکھتے لکھتے ان کے دل میں اس سے محض جذباتی ہمدردی ہی پیدا نہیں ہوگئی ، وہ خود اپنے زورِ قلم سے نفسیاتی طور پر مسحور ہو گئے جس کے نتیجے میں داد و تحسین کا غلو آمیز غلغلہ بلند کرتے ہیں ۔ میں نے قلم زد کلام کی شرح لکھتے وقت اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے ۔ میری رائے میں غالب نے اسے قلم زد کرکے بڑی اصابت رائے کا ثبوت دیا کیونکہ اس کا بہت بڑا حصہ محض ذہنی ورزش ہے جس میں روحِ شاعری مفقود ہے ۔ ہاں زیادہ سے زیادہ سو یا دو سو اشعار ایسے نکل آئیں گے جنھیں انتخاب میں لینا چاہیے تھا ۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اپنے تحقیقی مقالے 'غالب' میں غالب کے ابتدائی دور کی پوری شاعری قلم زد ، نیز متداول کا جائزہ لیا ہے اور اس پر فارسی شعرا شوکت بخاری ، مرزا جلال اسیر ، بیدل ، غنی کاشمیری ، ناصر علی اور اردو کے شاعر ناسخ کے اثرات کی نشان دہی کی ۔

آخری اہم کتاب جس کا میں ذکر کروں گا ، 'نقدِ غالب' ہے ۔ یہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کے تنقیدی مضامین کا نقشِ ثانی ہے ، جو ۱۹۵۶ء میں سامنے آیا ۔ اس مجموعے کے بیشتر مضامین بڑے قابل قدر ہیں کیونکہ ان میں دورِ حاضر کی تنقید کی ژرف نگاہی ہے ۔ میں خاص طور سے حمید احمد خاں کے مضمون 'غالب کی شاعری میں حسن و عشق' کا ذکر کروں گا ۔ میرا خیال ہے کہ غالب کے نظریۂ عشق اور تصورِ محبوب کا جتنا اچھا جائزہ اس مضمون میں لیا گیا ہے ، اور کہیں دکھائی نہیں دیتا ۔ پروفیسر احتشام حسین نے اپنے مضمون 'غالب کا تفکر' میں معاشی اور سوانحی پس منظر میں غالب کے ذہن کی بازیافت کی ہے ۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کے مضمون "غالب ، معتقدِ میر" کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ۔ پروفیسر آل احمد سرور نے غالب کی عظمت کی بنیادوں پر روشنی

۱۔ باقیات غالب ، صفحہ ۴۳ ، از وجاہت علی سندیلوی ، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۔ ۱۹۶۰ء ۔

ڈالی ہے ۔ اسلوب احمد انصاری نے غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر میں منجملہ دوسری باتوں کے غالب کے حکیمانہ مزاج ، تعقلی رنگ اور انگریزی شاعر ڈن (Donne) کے سے رمز بلیغ پر روشنی ڈالی ۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیہ نما مضمون نے ہمیں یہ مشہور جملہ دیا :

''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا ، تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا ۔ غالب ، اردو اور تاج محل ۔''

عجیب بات یہ ہے کہ نقدِ غالب کے کسی مضمون نگار نے غالب کی نثر نگاری پر نہیں لکھا ، ہاں قاضی عبدالودود نے ایک ایسا نرالا موضوع لیا ہے جس پر وہی قلم اٹھا سکتے تھے ''غالب بہ حیثیت محقق ۔'' غالب کی ایک حیثیت فارسی فرہنگ نویسی کے نقاد کی بھی ہے ۔ قاضی صاحب نے اسی کا جائزہ لیتے ہوئے غالب کی عربی و فارسی دانی پر تبصرہ کیا ہے ۔ سوا دو سو صفحات کے اس عالمانہ مقالے میں قاضی صاحب نے جس علم و فضل کا ثبوت دیا ہے اس کی مثالیں اردو تحریروں میں شاذ ہیں ۔ اس مضمون سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا قدیم فارسی سے واقفیت کا دعویٰ نرا دعویٰ ہی تھا ۔

غالب پر مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ جھنگ کے محمد حیات سیال نے مرتب کیا ہے ۔ اس کا نام غالباً ''احوال و نقد غالب'' ہے ۔ یہ میری نظر سے نہیں گزرا ۔

یادگارِ غالب اور آثارِ غالب کے علاوہ مندرجہ بالا تمام کتابوں میں غالب کی اردو تخلیقات ہی کو پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ چند سال پہلے ظ ۔ انصاری کی کتاب ''غالب شناسی'' آئی جس میں غالب کو اردو کے علاوہ فارسی شاعری کے آئینے میں بھی دیکھا گیا ہے ۔ اس کا آخری مضمون ''غالب کا ورثہ'' گو ہے تو مختصر لیکن نقد و نظر کے لحاظ سے اہم ہے ۔

اردو میں غالب پر جتنا زیادہ لکھا گیا ہے اتنا باستثنائے اقبال کسی اور ادیب پر نہیں لکھا گیا لیکن غالب پر جس پائے کے ادیبوں نے لکھا ہے اور جس قسم کی تاریخ ساز کتابیں لکھی ہیں وہ اقبال کا بہرہ نہیں ۔ غالب پر لکھنے والوں میں حالی ، عبدالرحمٰن بجنوری ، ڈاکٹر عبداللطیف ، غلام رسول مہر ، امتیاز علی عرشی ، شیخ محمد اکرام ، مالک رام ، مسعود حسن رضوی ، قاضی عبدالودود جیسے بزرگ ہیں اور یادگارِ غالب اور محاسن کلام غالب جیسی اہم کتابیں ہیں ۔ اگرچہ غالب کے اکثر نقادوں نے سخن فہمی سے زیادہ غالب کی طرف داری کا ثبوت دیا ہے لیکن آثارِ غالب اور نقدِ غالب جیسی تحریروں کے ہوتے راہ سخن فہمی میں خوف گمراہی نہیں رہتا ۔

فتح محمد ملک

غالب اور ہمارا قومی شعور

آج جب کہ غالب کے آفاقی انداز نظر اور انسان اور کائنات کے ظاہر و باطن سے آگہی کی دنیا بھر میں دھوم ہے ، غالب کے ہاں قومی شعور کی بحث چھیڑنا ایک فرقہ وارانہ سی بات نظر آتی ہے مگر اس محدود انداز نظر سے غالب کا مطالعہ اس لیے بامعنی ہے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت کی جڑیں اسی شعور میں پوشیدہ ہیں ۔ غالب کے بعد ہمارے دور غلامی میں حالی ، اکبر اور اقبال کے ہاں اجتماعیت کا احساس جس انداز سے ملتا ہے ، غالب کے ہاں وہ انداز تو بے شک ناپید ہے مگر غالب کے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا تھا ، اس سے وہ گہرے طور پر متاثر اور متصادم تھے ۔ غالب کے عہد میں ہندی مسلمانوں کا سیاسی اور تہذیبی زوال اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا ۔ غالب اپنی فنی جد و جہد سے اس زوال کو سمجھنے اور اس کے پس منظر میں انسان کے مقدر پر غور و فکر میں مصروف رہے ہیں :

سایۂ گل داغ و جوش نکہت گل موج دود
رنگ کی گرمی ہے قاراج چمن کی فکر میں

آنکھیں پتھرائی ہیں ، نامحسوس ہے تار نگاہ
ہے زمیں از بس کہ سنگیں، جادہ بھی پیدا نہیں

یک قلم کاغذ آتش زدہ ہے ، صفحۂ دشت
نقش پا میں ہے تب گرمی رفتار ہنوز

مستعد قتل یک عالم ہے جلاد فلک
کہکشاں موج شفق میں تیغ خوں آشام ہے

غالب کی فضائے سخن میں اجزائے آفرینش کی زوال آمادگی ، بزم جاناں سے بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل کا پریشاں نکلنا ، اجزائے بہار کا ربط یک

شیرازۂ وحشت ہونا ، نقش مدعا کا موج سراب نظر آنا اور ہر تعمیر میں خرابی کی ہزار صورتوں کا مضمر ہونا اسی سیاسی اور تمدنی انتشار کے باعث ہے ۔ اسی طرح ناخن تدبیر کے ٹوٹ کر رہ جانے اور اہل تدبیر کی واماندگیوں پر دل سوزی اور جناب خضر کی رہنائی کو رہزنی ثابت کرنے کے جتن محض انانیت کا کرشمہ نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کی اجتماعی بے چارگی کے شعور کا ثمر ہیں ۔ اپنے گرد و پیش کو اپنی ذات میں جذب کرکے غالب جب اپنی تہذیب کو فنا ہوتا دیکھتے ہیں تو صیغہ واحد متکلم کے باوجود ان کی آواز ایک پورے دور کی آواز بن جاتی ہے اور اس میں صدیوں کی گونج سنائی دیتی ہے :

یا رب ! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

خوشی کیا ، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئنہ تمثال دار تھا

مولانا حالی نے 'یادگار غالب' میں لکھا ہے کہ :

''غالب مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا ۔ ایسے ہی ایک موقع پر انھوں نے مجھ سے کہا :

' مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے ۔ پھر بھی میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں رنج اور تاسف ہوتا ہے ۔' ''

مذہب ، ادب اور معاشرے کی رسمیات سے بے نیازی ، رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے امتیازات سے ماورا تمام بنی آدم سے محبت اور وحدت الوجود کے صوفیانہ عقیدے سے شغف کو مسلمانوں کے ادب میں کفر پرستی کی روایت سے نا آشنا تنقید نے اسلام کی نفی گردانا ہے ، حالاں کہ یہ اسلام کی متحرک ، وسیع النظر اور روشن خیال اقدار کا اثبات ہے ۔ مسلمانوں کی ذلت اور رسوائی پر پیچ و تاب ہی غالب کے شاعرانہ تجسس اور فلسفیانہ تشکیک کا پیش خیمہ ہے :

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ، ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

غالب کے عہد میں ہم پر جو وقت پڑا تھا اس کا شعور اور اس کی ترجمانی غزلیات میں عمومیت اور آفاقیت کے انداز میں ہے تو خطوط اور قطعات میں وضاحت اور قطعیت کے ساتھ کار فرما ہے - جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جب انگریزوں کی وحشت و بربریت کی یلغار زوروں پر ہے ، ہر طرف کشت و خون اور شکست و ریخت کا ہنگامہ گرم ہے ، غالب گھرے دکھ کے ساتھ سوچ رہے ہیں :

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

غالب کو اور کیا کیا کچھ دیکھنا پڑا ؟ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ امن و امان کی فضا پیدا ہوئی تو غالب نے محسوس کیا کہ دلی شہر ، شہرِ خموشاں ہے - مسلمانوں نے صدیوں میں جو تہذیبی اقدار اور ادارے قائم کیے ہیں ، غالب کے سامنے ان کا قتل عام جاری ہے اور ہندی مسلمانوں کا تہذیبی مستقبل انتہائی مخدوش نظر آنے لگا ہے - ۵ دسمبر ۱۸۵۷ع کو غالب اپنے ایک ہندو دوست (ہرگوپال تفتہ) کو لکھتے ہیں :

''وہ ایک جنم تھا جس میں ہم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت در پیش آئے - شعر کہے ، دیوان جمع کیے - ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا ، نہ وہ اشخاص ، نہ وہ معاملات ، نہ وہ اختلاط ، نہ وہ ارتباط - بعد چند مدت کے دوسرا جنم ہم کو ملا - اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے ، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا ، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو ، آج آیا - اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے ، لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا - واللہ ڈھونڈے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا - ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں -''

یہ وہی غالب ہیں جو موحّد ہیں اور جن کا کیش ہے ترکِ رسوم ۔ مگر اس وقت بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کی اجتماعی ہستی کو کیوں مٹایا جا رہا ہے ؟ ہندوؤں کی اجتماعی ہستی کے لئے نئے تحفظات کہاں سے نمودار ہو رہے ہیں ؟ ہندو کہ جنگِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کے ساتھ تھا ، اب انگریز کے دامنِ دولت میں پناہ گزیں کیوں ہے ؟ یہ سوالات لب گور غالب کے غم کو ایک نئی پہنائی سے ہمکنار کرتے ہیں اور وہ ایک لٹتی ہوئی ملت اور مٹتی ہوئی تہذیب کا مرثیہ خواں بن جاتا ہے :

چوک جس کو کہیں ، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

ایک وسیع و عریض کائنات میں انسان کی ذہنی اور روحانی ترقی کی غیر مختتم آرزوؤں کا شاعر یہاں صرف مسلمانوں کے بارے میں سوچ رہا ہے :

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قتل
پچھے ہے جوگ مایہ اور دیبی
نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا
مگر ہاں نام کو اورنگ زیبی

وہ طرزِ احساس جو بعد میں دو قومی نظریے کی صورت میں پاکستان کی فکری اساس بنا ، پہلے پہل غالب کے ہاں ہی نظر آتا ہے ۔ صرف مسلمانوں کو انگریز کے تشدد اور صرف ان کے تمدن کو تباہی کا نشانہ بنتے دیکھ کر غالب بالآخر مسلمانوں کے مقدر کے بارے میں اس انداز میں سوچنے پر اس لیے مجبور ہوئے کہ اپنے ہزار سالہ دورِ حکومت میں مسلمان جس وسیع القلب ، روادار اور انسان دوست تمدنی مسلک کی آبیاری میں مصروف رہے تھے ، دورِ غلامی میں اُسے زندہ رکھنے کی یہی ایک صورت تھی ۔

غالب کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اکثر مراحل میں مرثیہ و ماتم تک محدود نہ رہے بلکہ انہوں نے قرونِ وسطیٰ کے حیات گریز صوفیانہ مسلک کو رد کرکے ایک ایسی گزرگاہِ خیال کو سینے کے بل طے کیا جہاں خضر کا سہارا بھی میسر نہ آ سکتا تھا :

بہ وادی کہ دراں خضر را عصا خفتست
بہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفتست

غالب کے طرز استدلال اور طریق تشکیک کے پیچھے مردہ پرستی کی مذمت، نیرنگِ تمنا کے تماشا اور حسن کائنات اور جمال آدم کی طرف والہانہ پیش قدمی کے جو رجحانات موجود ہیں، وہ ایک نئی دنیا آباد کرنے کی حسرت کے امین ہیں۔ چناں چہ غالب کی شوخیِ اندیشہ نے اگر ایک طرف عیش کوشی کے رویے کو خیر باد کہا :

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ ناؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سور، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

تو دوسری طرف مغرب سے آنے والے نئے علوم سے اپنی تیرہ بختی کو دور کرنے کا عزم بھی دیا :

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

قرونِ وسطیٰ کے ملبے سے عہدِ جدید کی تعمیر یعنی برق سے شمعِ ماتم خانہ روشن کرنے کا یہ جذبہ جہاں غالب کو آفاقی قد و قامت دیتا ہے، وہاں ہمارے قومی شعور کی خشتِ اول بھی ہے۔

میرزا ادیب

غالب کا ذہنی وطن

ایک بڑے فن کار کی مثال کسی وسیع اور عظیم الشان قصر کی سی ہے - اس قصر کے بے شمار کمرے ہیں اور ہر کمرے کے مختلف گوشے بھی ہیں - ہر کمرے میں کئی کھڑکیاں ہیں - جس وقت کوئی کھڑکی کھلتی ہے ، کمرے کا ایک گوشہ روشنی میں آ جاتا ہے - ایک اور کھڑکی کھل جانے سے دوسرا گوشہ نظر آنے لگتا ہے - کھڑکیاں کھلتی رہتی ہیں اور کمرے روشن ہوتے رہتے ہیں - مگر یہ عمل بہت آہستہ آہستہ ہوتا ہے - برسوں کے بعد کہیں جا کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اب تمام کھڑکیاں کھل چکی ہیں اور سب کے سب کمروں کی "موجودات" ہمارے سامنے آ چکی ہیں - لیکن یہ حقیقت زیادہ دیر تک اپنی جگہ برقرار نہیں رہتی - یکایک محسوس ہوتا ہے کہ ابھی بعض کمرے تو بدستور اندھیرے میں ہیں اور جو کچھ اب تک دیکھا جا چکا ہے ، اس کا ایک حصہ یا بیشتر حصہ ہمارے اپنے فریب نظر کے سوا اور کچھ بھی نہیں - اس کے بعد دیکھے ہوئے کمروں کو دوبارہ دیکھا جاتا ہے - کچھ باتیں واقعی فریب نظر ثابت ہوتی ہیں اور ان کا از سر نو نئے حوصلوں ، نئی بصارتوں اور نئی بصیرتوں کے ساتھ جائزہ لینے کا کام شروع ہو جاتا ہے -

کسی تخلیقی فن کار کے بارے میں یہ رائے قائم کر لینا کہ اس کے نہاں خانۂ دل و دماغ کی ساری کائنات ہماری نگاہوں میں سموئی جا چکی ہے ، محض خیال آرائی ہے ، کیونکہ نہ صرف یہ کہ ہم اس کے تمام گوشوں میں جھانک ہی نہیں سکتے بلکہ یہ بھی ہے کہ ہر عہد کا معیار نظر ادوار گزشتہ کے زاویہ ہائے نگاہ سے بہت حد تک میل نہیں کھاتا - اس لیے ہر دور اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے کسی مصنف کو پرکھتا ہے اور جب پرکھتا ہے تو بعض مسلمات کو رد کر دیتا ہے اور بعض روایات قبول کر لیتا ہے - اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کا فیصلہ آنے والا عہد بھی قبول کرے - نیا عہد اپنا معیار لے کر آئے گا اور اس کی دریافتیں ضروری نہیں کہ مصدقہ حقائق سے ہم آہنگ بھی ہوں - اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے -

موجودہ صدی کے اوائل سے غالب کو سمجھنے کی مسلسل کوشش جاری ہے - جتنی تفسیریں کلام غالب کی اب تک ہو چکی ہیں کسی اور اردو شاعر کی نہیں ہوئیں - بہت کچھ روشنی میں آ چکا ہے ، احوال و ذاتیات کے متعلق بھی اور افکار و ذہنیات کے بارے میں بھی ، مگر کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ نصف صدی کی تفہیم و تفکر کے بعد بھی غالبیات کا باب مکمل ہو گیا ہے اور اب اور کچھ کہنے کے لیے باقی نہیں رہا ؟ لاریب وجود بحر سطح سے لے کر تاریک تہ تک ہی محدود ہوتا ہے مگر سرکش موجوں کی وسعت ساحل کو بھی کارگہ تگ و تاز بنائے رکھتی ہے اور یوں بحر کی حدیں بدلتی رہتی ہیں اور مسلسل بدلتی ، بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہیں -

ہم غالب کے بہت قریب آ چکے ہیں ، پھر بھی جب غالب کے جہانِ شعری کے حدود و شعور پر نگاہوں کا کارواں رواں ہوتا ہے تو افق تا افق دھند میں لپٹی ہوئی بے کراں وسعتیں ہمیں بے اختیار بیدل کی ہم نوائی پر مجبور کر دیتی ہیں :

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمار ما

چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

غالب کا مطالعہ کرتے وقت بھی میں کئی بار اس شعر پر رک گیا ہوں :

باعث مرگ پدر سنجم و گویم ہیہات

نالہ چند کہ در کار قضا گشت تلف

اس شعر کا بظاہر وہی مفہوم متعین ہوتا ہے جس کی نشان دہی غالب کے ایک شعر کا یہ مصرع ثانی کرتا ہے :

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

منجملہ ہزاروں ستموں کے یہ بھی ایک ستم ہے مگر میں سمجھتا ہوں مرگ پدر کی غیر معروف ترکیب احوال غالب کے کسی ایسے گوشے کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو ابھی تک تاریکی میں ملفوف ہے -

غالب نے ''پدر'' کا لفظ ایک اور شعر میں بھی باندھا ہے :

با من میاویز اے پدر ! فرزند آزر را نگر

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

یہاں پدر صراحةً ایک علامت ہے اُس نسل کی جو ''مے و بادہ کو اندوہ رُبا کہتی ہے''- اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نئی اور پرانی نسل کے نظریاتی تصادم کی داستانِ طویل اس ایک شعر میں سمٹ آئی ہے - اس شعر میں پدر واقعتاً ایک علامت ہے - مگر اوپر کے شعر میں پدر کا وہ مفہوم نہیں ہے جسے کسی علامت سے ظاہر کیا جائے - یہاں پدر کا مفہوم وہی ہے جس کا تعین لغوی حیثیت سے

کیا جاتا ہے ۔ اگر ایسا ہے اور میرے زاویۂ نگاہ سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے تو پھر بات غالب کی ذاتیات کے ایک ایسے پہلو تک جا پہنچی کہ جو ہنوز ایک معما ہے اور نہ جانے کب تک معما ہی رہے گا ۔

بہرحال اس وقت مجھے اس طرف ایک اشارہ ہی کرنا تھا اور وہ میں کر چکا ہوں ۔ گفتگو آج غالب کے ایک اور پہلو سے ہے اور یہ پہلو کیا ہے ؟ اس کا ذکر ابھی کرتا ہوں مگر آغاز بحث میں ایک دو چیزوں پر روشنی ڈال دی جائے تو بہتر ہوگا ۔

دنیا کے بیشتر فن کاروں کو عموماً اس امر کی شکایت رہی ہے کہ زندگی بھر ان کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوئی جس کے وہ جائز طور پر مستحق تھے ۔ ہو سکتا ہے بعض لوگوں نے رسماً اور روایۃً بے قدری کا رونا رویا ہو لیکن فن کار کی اپنے زمانہ سے شکایت کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ دوسری زبانوں کے فن کاروں اور شاعروں کا ذکر تو چھوڑیے ، اردو شاعری کو ہی لے لیجیے ۔ معمولی شاعر نے بھی لبِ شکایت وا کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کی ۔ اس کی نفسیاتی توجیہہ ہم یوں کر سکتے ہیں کہ فن کار قدرتاً خود کو دوسروں سے بلند سمجھتا ہے اور اس کی یہ خود اہمیتی اسے ذہنی طور پر اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں معمولی انداز کا اعترافِ عظمت اسے مطمئن نہیں کر سکتا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر کے لیے زمانے کی بے مہری اور قدر شناسی کو ورد بنا لیتا ہے ۔ جب عام فن کار کا یہ عالم ہو تو پھر اُس شخص کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے جو اپنے متعلق علی الاعلان کہتا ہے :

غالب نام آورم ، نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے
بسترگانِ قوم پیوندیم ! !
ایبکیم از جماعۂ اتراک
در تمامی ز ماہ دہ چندیم

جب صورت حال یہ ہے تو غالب کو نا قدر شناسیِ عالم کی گلہ گزاری سے کون روک سکتا ہے ۔

غالب نے اپنے خدا سے ، اپنے مقدر سے اور اپنے زمانے سے بارہا شکوہ کیا ہے ۔ اردو شعروں میں بھی ، فارسی قصیدوں اور غزلوں میں بھی اور اپنے مکاتیب میں بھی ۔ ایسی شکایتیں دوسرے شاعروں نے بھی کی ہیں لیکن غالب کا لب و لہجہ اور غالب کا آہنگ دوسروں سے مختلف ہے ۔ شکایت کرتے ہوئے

بھی وہ اپنے مقام سے نیچے نہیں اترتا ، مگر غالب کے ہاں صرف یہی کچھ نہیں ہے ، اس کے ہاں کچھ اور بھی ہے اور وہ ہے غربت پسندی کا پہلو -

اگر اس سلسلے میں دو چار شعر کہہ دیے جاتے تو کوئی بات نہیں تھی - آخر شاعروں نے یوں بھی تو سوچا ہے کہ اپنے وطن میں ان کی قدر نہیں ہوئی - اگر وہ کسی اور ملک میں ہوتے تو زمانہ عقیدت کے نہ جانے کتنے پھول ان کے قدموں پر ڈھیر کر دیتا - لیکن غالب کا اس ضمن میں انداز فکر کچھ مختلف ہے اور اس نے بہ تواتر و بہ تسلسل اس امر کا اظہار کیا ہے - اُردو میں کم اور فارسی میں زیادہ -

اردو کے دو شعر سنیے :

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بےکسی کی شرم

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بےمہری یاران وطن یاد نہیں ؟

غالب نے کبھی ترک وطن نہیں کیا - جس سر زمین پر اس نے زندگی کا بیشتر حصہ گزارا ، مرکر بھی اسی خاک میں جذب ہو گیا - اس نے ترک وطن کی کبھی کوشش بھی نہیں کی اور ترک وطن کرتا بھی تو کس اُمید پر ؟ ایران کے ساسانی ، سامانی اور سلجوق ادوار ختم ہو چکے تھے - خود ایرانی شاعروں نے مغلیہ دربار میں پناہ ڈھونڈ لی تھی - صائب ، کلیم ، نظیری ، عرفی اور بیسیوں شاعر جمشید و فریدوں کا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے - کیا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ چونکہ غالب کے لیے ترک وطن کا کوئی امکان ہی نہیں تھا اس لیے وطن میں رہ کر بھی ذہنی طور پر غریب الوطن کی زندگی بسر کرتے رہے ؟

ان دو شعروں کے ساتھ اگر ایک اور شعر بھی شامل کر لیا جائے تو غالب کے نفسیاتی کوائف سمجھنے میں زیادہ مدد مل سکے گی - وہ شعر یہ ہے :

نہ جانے نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں ، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

دوسرا مصرع بطور خاص توجہ طلب ہے -

غالب جس دیار میں پیدا ہوئے ، وہاں کی فضاؤں سے وہ خود کو مانوس نہ کر سکے - پس منظر میں خاندانی عظمت کا شدید احساس ہو یا یہ احساس کہ اہنائے وطن اس کا رتبہ اور فضیلت سمجھنے اور قدر و منزلت کرنے سے یکسر

قاصر ہیں ، حقیقت کچھ بھی ہو ، وہ اپنے وجود کو گل اور ہندوستان کو گلخن تصور کرتے رہے - اس تصور کے سینے سے وہ چیز پھوٹی جسے ذہنی تضاد کہا جا سکتا ہے اور جب آدمی ذہنی طور پر اس منزل پر پہنچ جاتا ہے تو ترک وطن کے تمام وسائل مسدود پا کر ایک نفسی مفاہمت کی صورت بروئے کار لے آتا ہے جس سے وہ محسوس کرتا ہے کہ گویا غریب‌الوطن یا غریب شہر ہوگیا ہے - غریب الوطنی کوئی خوشگوار تصور نہیں ہے - یہ تصور اپنے ساتھ وہ ساری تکلیفیں لے آتا ہے جنھیں عملاً غربت کی زندگی سے وابستہ کر سکتے ہیں - یہ خود اذیتی لازماً رد عمل ہے وطن سے ذہنی فرار کا - خود اذیتی میں بھی ایک گونہ لذت ہوتی ہے - ایک خاصی کرب ناک کیفیت سے نفساً نجات حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کرب کو سینے سے لگا لیا جاتا ہے - ان تصریحات کی روشنی میں وہ شعر دوبارہ پڑھیے - ان ان کی ترتیب یوں ہوگی :

نہ جانے نیک ہوں یا بد ہوں ، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں ، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں ؟

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بےکسی کی شرم

یہ بات صاف ہو گئی کہ غالب ہندوستان سے توطن کی مفاہمت نہیں کر سکے - اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کا ذہنی وطن کیا تھا ؟ ذہنی طور وہ کس ملک کو اپنا صحیح وطن سمجھتے تھے یا موزوں الفاظ میں یہ کہ سمجھ سکتے تھے؟ بات آگے بڑھانے کے لیے کلام غالب کے مزید مطالعے کی ضرورت ہے - دنیا میں ہر شاعر اخذ مواد و فن میں دوسرے شاعروں سے متاثر ہوتا ہے - اگر اس بات کا اعلان کرنے سے احتراز کرتا ہے تو اس کے کلام کی داخلی شہادتیں واضح کر دیتی ہیں کہ یہ رنگ و نور کہاں سے لیا گیا ہے ، اور اگر وہ اعلان کر دیتا ہے تو پھر داخلی شہادتوں کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی - غالب نے بھی بعض شاعروں سے اپنی عقیدت ظاہر کی ہے - اردو میں میر تقی ہے ، فارسی میں مرزا بیدل ، عرفی ، ظہوری ، صائب اور نظیری ہے - اردو کو وہ اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی فارسی کو دیتے ہیں - اسی نسبت سے ان کی عقیدت میر سے ہے - رنگ بیدل وہ پچیس برس کی عمر تک پسند کرتے رہے - اب رہ گئے عرفی ،

ظہوری ، صائب اور نظیری تو ان میں سے ہر ایک کی بارگاہِ سخن میں انھوں نے عقیدت کے جذباتِ فراواں پیش کیے ہیں :

به نظم و نثر مولانا ظهوری زنده ام غالب
رگِ جان کرده ام شیرازه اوراقِ کتابش را

جوابِ خواجه نظیری نوشته ام غالب
خطا نموده ام و چشمِ آفرین دارم

ز فیض نطق خویشم با نظیری هم زبان غالب
''چراغی راکه دودے هست در سر زود درگیرد''

گشته ام غالب طرف با مشرب عرفی که گفت
روے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

یہ سب شاعر ، ظہوری ، عرفی ، نظیری اور صائب ایرانی نژاد ہیں ۔ ان سے غالب کو عقیدت ہے اس لیے ان کے وطن سے بھی عقیدت ہونی چاہیے ۔ بات یہاں ختم ہو جانی چاہیے مگر بات ختم نہیں ہوئی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب نے ان شاعروں سے کافی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے ، مگر تضاد بیانی غالب کا شیوۂ خاص ہے ۔ ایک جگہ وہ کسی کا عقیدت مند ہے تو دوسری جگہ اس کا حریف بھی بن جاتا ہے ۔ غالب لاکھ کہیں کہ وہ ان شاعروں کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو اسی صف میں دیکھتے ہیں جس صف میں یہ شاعر کھڑے ہیں ۔ وہ اپنی ذات کو ، شاعر کی حیثیت سے ان شعرا سے کم تر سمجھنے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں ۔ ایک نہیں کئی شعر اس کے ثبوت میں دیے جا سکتے ہیں :

ذوق فکر غالب را برده ز انجمن بیرون
با ظهوری و صائب ، محو هم زبانی هاست

او جسته جسته غالب و من دسته دسته ام
عرفی کسیست لیک نه چون من درین چه بحث

غالب از اوراق ما نقش ظهوری دمید
سرمهٔ حیرت کشیم دیده بدیدن دهیم

این جواب آن غزل غالب کہ صائب گفتہ است
در نمود نقشہا بے اختیار افتادہ ام ! !

غالب مذاق ما نتوان یافتن ز ما
رو شیوۂ نظیری و طرز حزین شناس

غالب از من شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت
از نوا جان در تن ساز بیانش کردہ ام ! !

غالب بہ شعر کم ز ظہوری نیم ولے
عادل شہ سخن رس و دریا نوال کو ؟

اور ایک شعر میں تو اس نے صاف طور پر ہی کہہ دیا ہے :

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

غالب کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ وہ خود کو ان ممتاز فارسی کے شاعروں سے کمتر سمجھنے کے لیے ہرگز تیار نہیں - یہ شاعر ایران کی خاک سے اٹھے ہیں - غالب ہندوستان کے شاعر ہیں - یہ چیز ان کے لیے ایک ذہنی کشمکش کا مواد مہیا کر دیتی ہیں اور اس کا نتیجہ اِن شعروں کی صورت میں نکلتا ہے :

بود غالب عندلیبے از گلستان عجم
من ز غفلت طوطیِ ہندوستان نامیدمش

غالب شراب تندی ہندم کباب کرد
زین بعد بادہ ہائے گوارا کشیدہ باد

گرفتہ خاطر غالب ز ہند و اعیانش
بدان سر ست کہ آوارۂ عجم گردد

غالبِ سوختہ جان را چہ بگفتار آری
بہ دیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

آبش گداز خاکی بادش تف بخارے
دہلی بہ مرگ غالب آب و ہوا نہ دارد

غالب سخن از ہند برون بر کہ کس این جا
سنگ از گہر و شعبدہ ز اعجاز ندانست

غالب از آب و ہوائے ہند بسمل گشت نطق
خیز تا خود را بہ اصفاہان و شیراز افگنم

غالب اپنی مثنوی ''باد مخالف'' میں طالب ، عرفی ، نظیری اور ظہوری کی تعریف کرنے کے بعد کہتا ہے :

آن کہ طے کردہ این مواقف را
چہ شناسد قتیل و واقف را

برہان قاطع کے معاملے میں غالب کی قتیل و واقف اور ان کے ہمدردوں کے ساتھ جو ہنگامہ خیز قلمی جنگ ہوئی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ غالب ان دو ہندی نژاد شاعروں کو زبان دان سمجھنے سے معذور تھے ۔ وہ کہتے تھے اور اور برملا کہتے تھےکہ فارسی پر عبور فقط انھی لوگوں کو حاصل ہو سکتا ہے جن کا مولد و منشا ایران ہے ۔ ہندوستانی لغت نویس لغت دانی کی پوری صلاحیت سے قاصر ہیں ۔ جب نظریہ یہ ہو تو غالب برہان قاطع کو فارسی کی مستند لغات کیونکر تسلیم کر سکتے تھے ؟

غالب حقیقتاً عظمت و جلال کا شاعر ہے ۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کی اس کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں ۔ ان کے دل میں عظمت ہے تو اُن شاعروں کی جو اصفہان و شیراز کی خاک سے اُٹھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ عجم سے رابطۂ توطن قائم کرنے کے لیے اس قدر بےقرار ہے ۔ اس کے مرزبوم کا شرف ہندوستان کے ایک شہر آگرہ کو حاصل ہوا اور اس زمانے میں یہ شہر تہذیبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا ۔ لیکن اس کی دلی آرزو یہی تھی کہ اس کا خمیر سبزہ زار ایران سے اُٹھایا جاتا ۔ اپنے ایک قصیدے میں کہتے ہیں :

ہان نگوئی کہ با چنین خواری
ترک ہندوستان نمی خواہم

اس ''نمی خواہم'' میں کتنی حسرت ہے ——— اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ۔

ڈاکٹر محمد باقر

غالب کا سیاسی ماحول

غالب کے سیاسی ماحول کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''سیاسی ماحول'' سے کیا مراد ہے ؟ مجھے کچھ اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ ''سیاسی ماحول'' کا مفہوم مختلف زبانوں میں مختلف قرار پائے گا کیونکہ اس کے لوازم ہر زمانے میں اگر بدلتے نہیں رہتے تو مختلف ضرور ہوتے ہیں ۔ مثلاً اگر ہم آج کل کے ''سیاسی ماحول'' کی کوئی تصویر پیش کرنا چاہیں تو اس میں آج کل کی ''سیاسی تاریخ'' ''سیاسی تحریکات'' ''سیاسی گٹھ جوڑ'' اور ''نیم مذہبی اور نیم سیاسی سرگرمیاں'' ''با اقتدار سیاسی جماعتوں کے ہتھکنڈے'' ''تعلیم میں سیاست کی مداخلت'' ''تجارت میں سیاسی حریفوں کی فتح و شکست'' یہ سب مظاہر ''سیاسی ماحول'' کی ترجمانی کرتے ہیں ، لیکن غالب کے زمانے میں نہ مہاجروں کی آبادکاری میں سیاست کے دخل کا مسئلہ درپیش تھا ، نہ مسلم لیگ ، احرار اور کانگرس کی تحریکات سیاسی ماحول پر مستولی نہیں ، لہٰذا غالب کے سیاسی ماحول میں اس زمانے کی تاریخ اور افراد پر نظام حکومت کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو پہلے اس سے غالب کے عہد کے سیاسی ماحول کا خاکہ تیار ہو جائے گا ۔ پھر اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے ان عوامل اور نتائج کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو اس دور میں سیاسی اعتبار سے اہمیت رکھتے تھے ۔ اس طرح غالب کے سیاسی ماحول کا مفہوم یہ قرار پائے گا کہ اس کے عہد کی سیاسی تاریخ اور اس کے زمانے کا سیاسی محیط کیا تھا ۔ بہت ممکن ہے غالب کے سیاسی ماحول کی یہ تعریف جامع نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تصریح کے دائرے کو اس طرح محدود کر دینے سے بہت سے مطالب معرض تحریر میں نہ آ سکیں ، لیکن اس مختصر صحبت میں مناسب یہی معلوم ہوا کہ مضمون کا مفہوم معین اور محدود کرکے آگے بڑھا جائے ، تاکہ وسعت مطالب سے منحرف ہونے کا اعتراض اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے خوش دلی سے قبول کیا جا سکے ۔ لیکن یہ

نہ ہو کہ انداز بیان سامع اور قاری پر گراں گزرنے لگے ۔

اس مقام پر ایک اور وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ نواب میرزا اسداللہ خاں غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۸ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے اور ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں فوت ہوئے ۔ اس طرح ان کے سیاسی ماحول کا امتداد ان دو تاریخوں اور ان دو مقامات کے بین بین سمٹ کے رہ جاتا ہے ۔ لیکن جیسےکہ آپ حضرات کو معلوم ہے ، غالب کی بیشتر عمر دہلی میں کٹی ۔ گو کلکتہ سے لے کر ریاست پٹیالہ تک ان کے مراسم رہے ۔ لیکن اس مضمون میں آگرہ سے لے کر کلکتہ اور پھر کلکتہ سے لے کر پٹیالہ کا سیاسی ماحول بیان کرنا مقصود ہے ، نہ ریاضی کی گنتی کے لحاظ سے غالب کی پیدائش سے لے کر اس کی موت کی تاریخ تک کے سیاسی ماحول کی تشریح ممکن ہے ۔ جغرافیائی لحاظ سے بیش تر توجہ دہلی پر مرکوز رکھی جائے گی اور سنین کے اعتبار سے تاریخ کا وہ حصہ سامنے رہے گا کہ جس نے غالب کو دنیا سے روشناس کرایا اور بالآخر اسے قرون آتیہ کے لیے یادگار بنا کر دیگر اکابر کی طرح اپنے اندر سمیٹ لیا ۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم

تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے (غالب)

غالب نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کے حصے بخرے ہو چکے تھے اور ان کی سطوت دم توڑ رہی تھی ۔ لال قلعے کے اندر شاہ عالم کا راج تھا ۔ قلعہ کے بازار کے باسی اس کی رعایا تھے اور شاہی خاندان کے افراد ، جن کا لقب ''سلاطین'' تھا ، قلعے کے اندر رہ کر انگریزوں کی دست برد سے محفوظ رہتے تھے ۔ درباری آداب اور رکھ رکھاؤ قلعے کے اندر نافذ تھا ۔ مغل شہنشاہوں کے آداب اور ان کی رسوم ابھی تک قلعے کے اندر مقبول تھیں ۔ انگریزوں کا ریذیڈنٹ دربار میں ابھی تک سفیر کی حیثیت سے پیش ہوتا ۔ وہ اور درباریوں کی طرح نقارخانے تک پہنچ کر گھوڑے سے اُتر پڑتا اور اس سے آگے لال پردے تک پیدل جاتا ۔ جہاں وہ دربار میں پہنچ کر دیگر درباریوں کی طرح کھڑا رہتا ۔ لیکن یہ سب کچھ ایک مجهوتے کے ماتحت ہو رہا تھا جو انگریزوں نے مغل شہنشاہ سے اس طرح کر لیا تھا کہ اسے ۶۰ ہزار روپیہ سالانہ ذاتی الاؤنس دے دیا تھا اور دیگر سالانہ گرانٹ ساڑھے گیارہ لاکھ روپیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ اسی آمدنی سے قلعے کی سلطنت کا کاروبار چلتا تھا اور اس سے ۷۹۵ سلاطین کو گذارہ ملتا تھا ، جو ۱۸۳۶ء میں اس تعداد میں قلعے میں موجود تھے ۔ اس کے علاوہ شہنشاہ کو قلعے کی مرمت اور تعمیر پر اسی رقم سے صرف کرنا پڑتا تھا ۔ شاہ عالم کے بعد اس کا لڑکا محمد اکبر ثانی ۱۸۰۶ء

میں تخت پر بیٹھا ۔ اس وقت تک شہنشاہ کا الاؤنس بڑھا دیا گیا تھا ۔ لیکن روپیہ کے مصرف اور اس کی تقسیم کا اندازہ صرف اس ایک امر سے لگائیے کہ اکبر شاہ کے تیرہ بھائی اور چودہ بہنیں تھیں اور اس کے چودہ لڑکے لڑکیاں تھیں ۔ اکبر شاہ کی وفات کے وقت یعنی ۱۸۳۷ء میں غالب کی عمر چالیس سال کی تھی اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء تک غالب نے بہادر شاہ ثانی کا زمانہ دیکھا ۔ لیکن یہ مغل بادشاہ غالب کے بادشاہ نہ تھے ۔ انھیں سیاسی ماحول میں صرف نام کی فوقیت حاصل تھی اور انگریز رفتہ رفتہ اس علاقے کے نہ صرف سیاسی حکمران بن چکے تھے ، بلکہ بہادر شاہ کے زمانے میں انھوں نے بادشاہ کو نذر نہ گذار کر بادشاہ کی رسمی برتری کا جؤا بھی اُتار پھینکا تھا ۔ ان سیاسی حالات کو اکثر مسلمان ابھی تک شک و شبہے کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ۔ کچھ لوگوں کو یہ امید تھی کہ شاید ایک دفعہ پھر مغلئی شہنشائیت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ آفتابِ عالمتاب بن جائے گا ۔ لیکن غالب اس عقیدے کے حامل نہ تھے کیوں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے ہی غالب ملکہ وکٹوریا "دانا دلان دادگر انگلینڈ" مسٹر سٹرلنگ ، لارڈ آکلنڈ ، ولیم فریزر ، کالون ، مکناٹن اور کئی دیگر معروف اور غیر معروف انگریزوں کے قصیدے یا ان کی تعریف میں مدحیہ اشعار لکھ چکا تھا ۔ ظاہر ہے کہ غالب نے یہ بالیقین سمجھ لیا تھا کہ انگریزوں کی عمل داری کو اب کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی ۔ مغلئی دربار نے ایک خاص قسم کا سیاسی ماحول چند سال سے پیدا کیا ہوا تھا اور اس ماحول میں شاعر یا مصنف کو کئی حیثیتیں حاصل تھیں ، جن میں سے ایک حیثیت یہ تھی کہ وہ اپنے علم اور وجدان سے الگ ہٹ کر محض قصیدہ گو شاعر بن جاتا تھا ۔ غالب عام انسانوں کی طرح اسی سیاسی ماحول سے متاثر تھا ۔ انگریزوں کے چڑھتے ہوئے سورج کا جب اسے یقین ہو گیا تو اس نے مغلئی سیاسی ماحول میں سے مغل شاہنشاہوں کی تصاویر نکال کر ان کی جگہ انگریزی ملکہ اور انگریز افسروں کو لا رکھا اور پھر ان کے قصیدے پڑھنے لگا ۔ یہ اکثر کہا گیا ہے کہ غالب نے کسی انگریز کی بے جا خوشامد نہیں کی ، لیکن یہ مقولہ کامل طور پر درست نہیں ، کیوں کہ ایک تو "بے جا" کا لفظ اضافی قدر و قیمت کا حامل ہے اور دوسرے جب ہم اس طرح کے اشعار پڑھتے ہیں تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ غالب نے خوشامد ضرور کی ، بے جا ہے یا نہیں ، اس کا فیصلہ آپ کریں :

جہاندار وکٹوریہ کز فروغش ز آتش دمد لالہ زار چراغاں
ز عدلش چناں گشتہ پروانہ ایمن کہ شد دیدبان حصار چراغاں
بفرمان سر جان لارنس صاحب شد ایں شہر آئینہ دار چراغاں

بدیلی فلک رتبہ سانڈرس صاحب ‌‌‌‌‌‌ بر آراست نقش و نگار چراغاں
شد از سعی ہنری اجرٹن بہادر ‌‌‌‌‌‌ رواں ہر طرف جویبار چراغاں

اور اسی طرح کے یہ اشعار ہیں جو غالب نے انگریزوں کی تعریف میں ۲ جنوری ۱۸۴۶ء کو اس وقت لکھے جب انھوں نے پنجاب کا ایک حصہ فتح کیا:

زین سو بہادران جہان جوی نامدار ‌‌‌‌‌‌ استادہ زیر ظل لوای گورنری
زاں سو سیہ دلان کج اندیش بد نہاد ‌‌‌‌‌‌ در سر فگندہ باد خلاف از سبک سری
داغ جبین دہر ز ناپاک مشربی ‌‌‌‌‌‌ روز سیاہ خویشتن از تیرہ اختری
دانا دلان داد گر انگلند را ‌‌‌‌‌‌ بخشیدہ حق ز بسکہ بہر شیوہ برتری
دارند ہم بہ تیغ زنی زور رستمی ‌‌‌‌‌‌ دارند ہم بہ کج کلہی فر قیصری
لاہوریان بہ رزم ستیز گریز پای ‌‌‌‌‌‌ کردند در گریز دغائی و صرصری

اس مختصر صحبت میں اس کی گنجائش نہیں کہ تفصیل سے یہ بتایا جا سکے کہ انگریزوں کی آمد آمد اور ان کی فتح مندی سے دربار داری کا جو ماحول پیدا ہوا ، اس میں ہمارے شاعر نے کس کس انداز و تیور سے شرکت کی ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ماحول مغلوں کا پیدا کیا ہوا تھا اور اب جبکہ ان کی جگہ انگریز لے رہے تھے ، لوگوں نے ان کی طرف عقیدت کا رخ پھیر دیا تھا ، اور دیگر پڑھے لکھے لوگ بالکل اسی طرح شامل تھے جیسے آج کل با اقتدار لوگوں کی ہر سیاسی چال پر لوگ ریڈیو ، ٹیلیویژن اور اخبارات میں واہ واہ کے ڈونگرے برساتے ہیں ۔ مجبور عوام کا یہ اضطراری فعل ہے جو روز ازل سے لے کر ابد تک ظہور پذیر ہوتا رہے گا ۔

جس طرح سیاسی ماحول میں انگریزوں کی زبانی مدح سرائی کا عنصر ہمیں اس دور میں نظر آتا ہے ، اسی طرح اس زمانے میں ایک اور اہم حقیقت ہمارے مشاہدے میں آتی ہے کہ مفتوح لوگ دل سے ان کی عزت نہیں کرتے تھے ، اور جیسا کہ قاعدہ ہے ، ان کے خلاف جذبات حقارت و نفرت کی پرورش کرتے رہتے تھے ۔ یہی جذبات بالآخر سنہ ستاون کے ہنگامے کی شکل اختیار کرتے ہیں ، جسے انگریز غدر کے نام سے پکارتا ہے اور ہم جنگ آزادی کہتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ غدر تھا ، نہ جنگ آزادی بلکہ اُن جذبات نفرت کا اظہار تھا جن کی پرورش مفتوح قوم ایک فاتح کے خلاف کرتی رہتی ہے ۔ اس ہنگامے کو بین الاقوامی تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ، کیوں کہ اس کا بہت چرچا ہوا ۔ لیکن اس وسیع پیمانے پر بھڑکنے والی آگ کے علاوہ ہمیں اسی دور میں چند چھوٹے چھوٹے واقعات بھی ملتے ہیں ، جن سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ مفتوحین کے دلوں میں یہ آگ کس طرح چپکے چپکے سلگ رہی تھی ۔ ہم یہاں صرف ایک واقعے کا ذکر

کریں گے جس سے غالب کا بھی کچھ تعلق تھا - اور اس واقعے سے عیاں ہو جائے گا کہ سنہ ستاون سے پہلے بھی کچھ لوگ فاتح انگریز کے خلاف سازش کر رہے تھے اور ابھی تک اس کی ہیبت و جبروت کا وہ سکہ قائم نہیں ہوا تھا جس نے سنہ ستاون کے بعد لوگوں کو مکمل طور پر کچل کے رکھ دیا - بلکہ ابھی تک سازشی اس قدر نڈر تھے کہ انگریز حاکموں کو قتل کرانے سے بھی نہیں چوکتے تھے - یہ واقعہ بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اس لیے اختصار سے کام لیا جائے گا -

غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں تھے جو نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکہ و رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے - نواب احمد بخش خاں کی دو بیگمیں تھیں - ایک میواتی الاصل تھی جس کے بطن سے نواب کا بڑا صاحب زادہ شمس الدین احمد خاں تھا - دوسری بیگم نواب کی ہم قوم تھی جس کے بطن سے امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں تھے - احمد بخش خاں نے ۱۸۲۳ء میں اپنے بڑے صاحب زادے شمس الدین کو اپنا جانشین مقرر کیا لیکن خاندان کے تقاضے اور چھوٹے صاحب زادوں کو خوش کرنے کے لیے شمس الدین سے لوہارو کی جاگیر سے دست برداری کا اقرار نامہ لے کر لوہارو امین الدین اور ضیاء الدین کو دے دیا - احمد بخش خاں ۱۸۲۷ء میں فوت ہوئے اور ان کی وفات کے بعد شمس الدین نے دعویٰ دائر کرکے ایک دو عدالتوں اور افسروں کے فیصلوں کے بعد پھر ۱۸۳۲ء میں لوہارو اپنے قبضے میں کر لیا ، اور فیصلہ یہ ہوا کہ انتظام کے اخراجات وضع کرنے کے بعد بقیہ رقم یہ چھوٹے بھائیوں کو دے دیا کریں گے - ولیم فریزر ۱۸۳۰ء میں دہلی میں گورنر جنرل کا ایجنٹ ہو کر آ گیا تھا - جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ، غالب نے فریزر کی تعریف میں اشعار بھی لکھے تھے - فریزر نے شمس الدین کے خلاف مرکزی حکومت کو خط بھی لکھے اور امین الدین کو کلکتہ بھی بھیجا کہ وہ اپنے باپ کی تقسیم کے مطابق اپنے ورثے کا تقاضا کرے - فریزر نواب احمد بخش خاں کا دوست بھی تھا اور شمس الدین اور اس کے چھوٹے بھائی اسے چچا کہہ کر پکارتے تھے - لیکن ورثے کی تقسیم کے معاملے میں فریزر شمس الدین کا ہمنوا نہ تھا - بلکہ جب شمس الدین اسے دہلی ملنے گیا تو اس نے اسے اپنے مکان سے یہ کہہ کر نکلوا دیا کہ تم ظالم انسان ہو - فریزر کے دوست جیمز سکنر نے فریزر کو اس کی اس حرکت پر فہمائش کی تو اس نے اسے بھی یہ جواب دیا "میں نواب کو ابھی تک ایک لڑکا سمجھتا ہوں اور اس کی اصلاح کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے "-

لیکن شمس الدین کے دل میں ان حالات کی وجہ سے بغض اور کینے کی آگ بھڑک اٹھی اور بالآخر اس نے اپنے ایک ملازم کریم خاں سے ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء

کو فریزر کو اس وقت گولی سے ہلاک کرا دیا جبکہ وہ رات کے گیارہ بجے کشن گڑھ کے راجا کی پارٹی سے گھوڑے پر سوار ہو کر آ رہا تھا۔ سازش کی مکمل تفصیل کچھ دیر کے بعد طشت از بام ہو گئی اور شمس الدین اور کریم خاں کو مقدمہ چلانے کے بعد ۳ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری دروازے کے باہر پھانسی دے دی گئی۔ غالب، شمس الدین کی روش سے مطمئن نہ تھے اور فریزر کے قتل کے بعد انھوں نے اس واقعے پر یوں تبصرہ کیا ہے:

''یکے از ستمگران نا خدا ترس کہ بہ عذاب ابدی گرفتار باد، ولیم فریزر بہادر را کہ ریذیڈنٹ دہلی و غالب مغلوب را مربی بود، در شب تاریک بہ ضرب تفنگ کشت و مرا غم مرگ پدر تازہ گشت''۔

اور پھر ایک غزل کے مقطعے میں کہتے ہیں:

غالب ستم نگر کہ چو ولیم فریزری

زینساں بجیرہ دستی اعدا شود ہلاک

شمس الدین کا کارنامہ اور غالب کا تاثر اُس عہد کے سیاسی ماحول کی واضح عکاسی کرتے ہیں کہ ایک طرف تو رعایا کا یہ جذبہ تھا کہ وہ حاکم کے خلاف سازش کرکے اُسے قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے، دوسری طرف غالب کی مانند ایسے لوگ بھی تھے جو ان واقعات پر نہ صرف خون کے آنسو بہاتے تھے بلکہ انگریزوں کے لیے اپنوں کے خلاف مخبری بھی کرتے تھے۔ مخبری کرنے کی روداد غالب کی اپنی زبان سے سنیے۔ یہ ایک خط کا متن ہے جو انھوں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا ہے اور جس میں اس مخبری کے الزام سے بری ہونے کی کوشش کی ہے:

''مجسٹریٹ بہادر کہ با من سابقۂ معرفتی و علاقۂ مودتی داشت، و در آن انزوا کہ گفتہ شد، من . . . گاہ گاہ بہ نزد وی رفتمی و نفسی چند خوش گذاردمی۔ چون این واقعہ رو داد، مرا در پژوہش کار و دخل اسرار باخود انباز ساخت۔ تا آن شد کہ والی فیروز پور جھرکہ مجرم قرار یافت و بہ حکم سرکار با تنی چند از خاصان خود اسیر شد . . . چون میانۂ من و وی ناسازگاری بود و مردم شہر آن را می دانستند، ہمگی در من افتادند و گرفتاری آن کافر نعمت داورکش بہ گردن من بستند۔''

سیاسی ماحول میں چند با اقتدار شخصیتوں کی بد کرداری اور رشوت خوری کے واقعات بھی ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں۔ ان تمام واقعات میں سے اہم واقعہ سر ایڈورڈ کولبروک اور لیڈی کولبروک کا ہے۔ سر ایڈورڈ جولائی ۱۸۲۷ء میں دہلی کا ریذیڈنٹ مقرر ہوا۔ انگریزی سرکار کا توشہ خانہ ریذیڈنٹ

کی تحویل میں ہوتا تھا اور ریذیڈنٹ کو جو تحائف پش کیے جاتے تھے ، وہ اس توشہ خانے میں جمع کرا دیے جاتے تھے - پھر کبھی کبھی انھیں نیلام کرکے نقد روپیہ وصول کرکے سرکار کے خزانے میں داخل کر دیا جاتا تھا - کولبروک اور لیڈی کولبروک نے ان تحائف کو خود سستے داموں خرید کر اپنی بہت سی جائداد بنا لی - لیکن اتفاق سے ایک بیس سالہ نوجوان انگریز چارلس . . . نے سارا معاملہ جانچ کر کلکتے کی مرکزی حکومت کو مفصل اطلاع دے دی کہ لیڈی کولبروک بعض شالوں کی قیمت پانچ پانچ سو روپیہ اس عذر پر گھٹا دیتی ہے کہ انھیں کیڑا لگا ہوا ہے — پاکستان بننے کے بعد لاہور میں بعض بھگوڑے ہندو رُؤسا کے قالین اسی عذر پر با اقتدار مسلمانوں نے اسی طرح خریدے — لیکن انگریز ابھی نیا نیا حاکم بنا تھا اور اپنی حکومت کی بنیادیں استوار کر رہا تھا اس لیے اس نے بد دیانت افسروں کو عبرت ناک سزائیں دیں - چنانچہ سرایڈورڈ اور لیڈی کولبروک کو بھی عہدے سے ہٹا دیا گیا -

یوں تو سنہ ستاون کے ہنگامے سے پہلے بھی غالب کے سیاسی ماحول میں کسی طرح کا سکون ، امن اور چین نہ تھا - غالب نے نظم اور نثر دونوں میں متعدد مقامات پر اپنی بے چینی اور بے بسی کا اظہار کیا ہے - خوف طوالت سے اس وقت مثالیں حذف کی جاتی ہیں لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ستاون کے بعد دہلی میں عام بے نظمی شروع ہو گئی تھی - جن لوگوں نے اس ہنگامے میں عملی اور پرجوش حصہ لیا تھا ، ان میں سے کچھ مارے جا چکے تھے ، کچھ بھاگ کر روپوش ہو گئے تھے اور جو بچ رہے تھے ، ان پر انگریز طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے تھے - لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے غالب کی طرح اس ہنگامے میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا تھا - اس کے باوجود ان کی گیرودار شروع ہو گئی تھی - غالب کی تصنیفات میں ہمیں ان واقعات کی تفاصیل ملتی ہیں کہ کس طرح خود غالب ، حکیم احسن اللہ خاں ، مولانا فضل حق خیرآبادی اور منشی صدر الدین جیسے بزرگ ان مظالم کا شکار ہوئے - الغرض یہ ایک خوف و ہراس اور بدگمانی کا سیاسی ماحول تھا جس میں غالب جی رہے تھے اور موقع ملنے پر اپنی تصانیف ، اشعار اور خطوط میں دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے - اس مختصر صحبت میں اس سیاسی ماحول کی صرف چند جھلکیاں ہی پیش کی جا سکی ہیں ، لیکن میرا عقیدہ ہے کہ صرف غالب کے اس سیاسی ماحول کی عکاسی کرنے کے لیے اس قدر مواد ہے کہ اس سے ایک کتاب ترتیب دی جا سکتی ہے - اگر فرصت ملی تو یہ کام سر انجام دیا جائے گا ورنہ غالب کے بقول :

خوشست افسانۂ درد جدائی مختصر غالب
بہ محشر میتوان گفت آنچہ در دل ماندہ است امشب

عشرت رحمانی

غالب کی ادا شناسی اور نواسنجی

حضرت شاہ غوث علی قلندر پانی پتی نے مرزا کے اطوار و کردار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

”(مرزا غالب) نہایت خوب آدمی تھے ۔ عجز و انکسار بہت تھا ۔ فقیر دوست بہ درجہٴ غایت اور خلیق از حد تھے ۔ رند مشرب اور رحم دل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے ۔“

ان تمام خوبیوں کے علاوہ مرزا کی ایک صفت ادا شناسی اور نکتہ سنجی سب سے نمایاں تھی ۔ یہی انفرادی خصوصیت ان کی شخصیت میں بانکپن ، کردار میں نکھار اور فکر و فن میں نرالا پن اور جدت و ندرت پیدا کرنے میں پیش پیش رہی ، یہاں تک کہ ان کی شاعری ، ان کے طرز انشا اور ان کی سیرت و شخصیت کی انوکھی علامت بن گئی ۔

دوست داری ، انسان دوستی ، اقربا نوازی اور غربا پروری کے ساتھ افلاس اور قرضداری بھی مرزا کی زندگی کے آخری ایام کی ایک خاصیت ہو کر رہ گئے تھے اور اپنی تمام تر فنی عظمت اور بلندیٔ کردار کے باوصف حالات زمانہ اور گردش روزگار سے مجبور ہو کر وہ اہل جاہ و ثروت اور مخلص احباب و اعزا کی امداد کا سہارا لینے سے اجتناب نہ کر سکے ۔ باوجود اس کے مرزا کی دیانت داری اور ادا سنجی کا یہ تقاضا بھی رہا کہ انھوں نے کبھی کسی بد باطن ، ریاکار اور بد دیانت شخص کا اعتبار نہ کیا اور نہ کسی صورت میں اس کے احسان سے زیر بار ہونا قبول کیا ۔ وہ جانتے تھے کہ منشی جیون لال اور میر رجب علی وطن کے غدار اور محسن کش ہیں ۔ ان قوم فروشوں نے اپنے ولیٔ نعمت ، بہادر شاہ ظفر کے خلاف انگریزوں سے مخبری اور غداری کی تھی اور بادشاہ کے مقدمے میں ان کے خلاف شہادتیں بھی دی تھیں ۔ چنانچہ ایک بار میر رجب علی نے مرزا صاحب کو ایک کشمیری شال تحفۃً بھیجی ۔ انھوں نے اسی وقت وہ شال واپس کر دی اور لکھا کہ :

”منت پذیرفتن از ترک و تاجیک ننگ است ۔“

یہ صرف اس لیے کہا کہ وہ رجب علی کو تنگ قوم سمجھتے تھے ورنہ مرزا کے مسلک میں کسی کی دل آزاری گناہ عظیم تھا ۔ اگر اس شخص سے شدید نفرت نہ کرتے ہوتے اور غدار وطن ہونے کا یقین نہ کرتے تو خواہ وہ کوئی بھی ہوتا صرف اس خیال سے کہ اس کا تحفہ لوٹا دینے سے اس کی دل شکنی ہوگی ، اسے قبول کر لیتے ۔ یہ خودداری اور ادا شناسی کا عالم تھا ۔ اور فراخ حوصلگی کی یہ کیفیت تھی کہ جب انگریزی سرکار نے ان کی پنشن بحال کی اور لفٹیننٹ گورنر کی طرف سے جمعدار اور چپراسی سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے لے کر آئے تو مرزا صاحب کے پاس چپراسی اور جمعدار کو انعام دینے کی غرض سے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی لیکن انھیں اپنے دروازے سے انعام کے بغیر بھی لوٹانا گوارا نہ تھا لہٰذا ان دونوں کو ایک علیحدہ مکان میں بٹھا دیا گیا اور نوکر کو خلعت مع رقوم جواہر بازار بھیجا کہ فروخت کرکے ان کی قیمت لائے اور چپراسی ، جمعدار کو وہ رقم انعام میں دے کر رخصت کیا ۔

دنیا کا یہ دستور شاید ہمیشہ سے ہے اور رہے گا کہ دولت و اقتدار کی تقسیم میں عدم مساوات قائم رہے تا کہ نیرنگیٔ روزگار کی کرشمہ آرائی کم نہ ہونے پائے ۔ اسلامی مساوات نے اس تفریق کو مٹانے کی تعلیم دی مگر ان برکات سے متمتع اور بہرہ مند ہونا بھی تو شرط ہے ۔ ہر عہد کے اکابر ، فضلا اور مشاہیر ارباب فن اس دو رنگی کا شکار رہے ۔ غالب کی بھی یہی کیفیت تھی ۔ انھیں خود اس کا بخوبی احساس تھا لیکن وہ اس حقیقت پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ان کی عظمت کو مستقبل میں تسلیم کیا جائے گا ۔ فرماتے ہیں :

''گرچہ یک فنہ ہوں مگر مجھے ایمان کی قسم ! میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بایست نہیں پائی ۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا ۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں ، بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے ۔''

پھر ارشاد فرمایا :

''نظم و نثر کے قلم رو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا ۔''

زمانہ ارباب فکر و نظر سے حسد کرتا آیا ہے ۔ غالب کے حاسدین کی بھی ایک بڑی تعداد تھی ، جو ان کے کمالات سے جلتے اور ان کی پریشاں حالی پر خوش ہوتے تھے ۔ حالانکہ خود مرزا کی انسان دوستی اور مرنجاں مرنج طبیعت کا خاصہ یہ تھا کہ فرماتے :

''میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں ۔ دوسرا مانے یا نہ مانے ۔''

مگر دنیا دار مفسدہ پردازوں کا یہ حال تھا کہ مرزا کی ذات پر طرح طرح کے اتہام لگاتے ۔ دشنام طرازی سے باز نہ آتے ۔ اگر اس امر کی اطلاع پاتے کہ مرزا صاحب کی قدر دانی اور شایان شان منزلت کی گئی ہے تو افواہیں مشہور کرکے انھیں بدنام کرنے کی ناپاک سعی کرتے ۔

ریاست رام پور کے نواب یوسف علی خان بہادر کو غالب سے کمال عقیدت تھی اور والی ریاست ہونے کے باوجود صاحب ذوق تھے ، اس لیے مرزا کے کمال فن کی قرار واقعی قدر کرتے تھے ۔ جب مرزا کو ایک زمانے میں رام پور جانے کا موقع ملا اور نواب صاحب نے ان کی بجا تعظیم و تکریم اور میزبانی کی ، تو وہاں سے واپسی پر دہلی کے حاسدوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں ۔ مرزا نے اس کیفیت کا اظہار ایک دوست کے خط میں اس طرح کیا ہے :

''میاں ! میں جو آخر جنوری (۱۸۶۰ء) کو رام پور جا کر آخر مارچ میں یہاں (دہلی) آ گیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں ۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص والیِ رام پور کا اُستاد تھا اور وہاں گیا تھا ۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار روپے سے کم نہ دیا ہوگا ۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نہ رکھا ۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا ، دو سو روپیہ مہینہ کر دیا تھا ، نواب لفٹیننٹ گورنر الہ آباد جو رام پور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو ۔ نواب صاحب نے بر طرف کر دیا ۔ یہ تو سب سن لیا ۔ اصل حقیقت سنو ۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس پینتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے شاگرد ہیں ۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے ، اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں ۔ بلاتے رہتے ہیں ، اب میں گیا ، دو مہینے رہ کر چلا آیا . . . بھائی سو دو سو میں کلام نہیں ۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں ، مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں ۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی ۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے ، وہ صورت ملاقات کی ہے ۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی ۔ بہرحال غنیمت ہے ۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے ، کمی کا شکوہ کیا ۔''

مختصر یہ کہ غالب کی ادا سنجی کا اسلوب جدا گانہ تھا ۔ ان کا طرز معاش جدا ، رفتار و گفتار جدا اور فکر و بصیرت کا انداز جدا تھا ۔ بقول غالب :

"شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے ۔"

اور ان کی ساری عمر اسی ادا شناسی میں بسر ہوئی ۔ جہاں جس حیثیت میں بھی کوئی ادا سنج ملا ، اس کی ادا پر مر مٹے :

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

مرزا کی فطری سادگی اور صفائی قلب کا پیغام انسانیت کے لیے عام تھا کہ :

روک لو گر غلط چلے کوئی ‏ ‏ ‏ ‏ بخش دو گر خطا کرے کوئی

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے ‏ ‏ ‏ ‏ جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیے

لیکن غالب حقیقی انسانیت کی تلاش سے مایوس ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ :

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب ‏ ‏ ‏ ‏ کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

یہی تلاش و جستجو غالب کی زندگی کی غرض و غایت اور یہی ان کے فکر و فن کا سرمایہ ہے :

ہمہ نا اُمیدی ، ہمہ بد گمانی ! ‏ ‏ ‏ ‏ میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

اور یہی لوا سنجی و نکتہ سرائی :

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

مطالعۂ کتب کے فروغ کے لیے قومی کتاب مرکز ، پاکستان کا ماہوار ترجمان

کتاب لاہور

زیر نگرانی

ابن انشا

زیر ارادت

سید قاسم محمود

ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

۱ ۔ منٹگمری روڈ ، لاہور

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

غالب کی تفہیم

غالب کوئی غیر معمولی وسیع المطالعہ اور اس کے نتیجے میں کوئی بڑے مفکر قسم کے شخص نہیں تھے - اگر وہ اعلیٰ مفکر ہوتے تو شاید اتنے مقبول بھی نہ ہوتے کیونکہ عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتے - وہ زیادہ عوامی سطح کے ایک عوامی مفکر تھے ، جیسا عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا بھی غیر معمولی ذہن رکھنے والا ہر شخص ہر زمانے اور ہر سماج میں ہو لیتا ہے - شعر گوئی کا سلیقہ تھا ، ایسا کہ معمولی بات بھی مزے سے کہتے تھے - سوچتے تھے ، غور بھی کرتے تھے اور نکتہ آفرینی بلکہ دوسروں سے ہٹ کے بات کہنے کی کوشش میں بھی رہتے تھے - اس کوشش نے اردو شاعری کو خاصی بڑی تعداد میں ایسے شعر مہیا کر دیے جس سے غالب کی شاعری محض فن مجلسی سے آگے بڑھ کے ذہن کی کشود کی سبیل بھی بن گئی - اُردو شاعری کو سوچتے ہوئے ذہن کی یہ بخشش یقیناً غالب کی ایک بڑی دین ہے - غالب کی تفہیم کے سلسلے میں یہ پہلا بنیادی نکتہ ہے جسے نظر انداز نہیں ہونا چاہیے -

مگر ساتھ ہی ، غالب نے ابتدائی عمر میں جو مہمل کلام کہا یا ایسا جس میں محض ذہنی یا لفظی جمناسٹک ہے ، بار بار پڑھا جانے کے سبب وہ بھی معنی دار کہلایا جانے لگا ہے - اس گم رہی سے بچنے کی بھی ضرورت ہے -

ابھی پچھلے دنوں ایک دوست سے جدید ترین اردو شعر پر گفتگو ہو رہی تھی - درمیان میں انھوں نے ایک جدید ترین اور معروف شاعر کے بارے میں بتایا کہ اس نے خود ان سے کہا ''چونکہ سیدھے سادے طریقے ہر شعر گوئی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اس لیے میں نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی !''

غالب نے جان بوجھ کر تو مہمل نہیں کہا ہوگا لیکن طرز بیدل میں ریختہ کہنا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی کہ کوئی چونکے تو - اسی درمیان میں مہمل شعر بھی ہوتے گئے ، بامعنی بھی -

سو غالب شناسی کے سلسلے میں یہ دوسرا اہم نکتہ ہے کہ بامعنی شعر کو بامعنی اور مہمل شعر کو سہمل سمجھنا ضروری ہے اور اس کے لیے بجنوری کی نظر سے دیکھنے کے بجائے خود بلا کسی رنگ کی عینک لگائے اپنی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے ۔

غالب کو انیسویں صدی کی اردو شاعری میں سے نکال دیجیے تو آپ کے پاس شاید (نظیر کے سوا) کم ہی کوئی ایسی چیز بچے گی جسے صائع ہوتے دیکھ کے آپ کو ایسا لگے گا جیسے آپ کی تہذیب دم توڑ رہی ہے ۔ کسی میں بھی کبھی اتنی جان اتنی سکت ہے ہی نہیں ۔ غالب کی ہر رنگ میں وا ہو جانے والی شخصیت کی رنگا رنگی نے شعر کے تنگ میدان میں اپنے اظہار کے اتنے پہلو ڈھونڈ لیے کہ اردو غزل سچ مچ اردو کی آبرو بن گئی ۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ غالب کو پیدا کر کے بھی اردو سعر اور شعر فہمی دونوں کے افق عرصے تک وسیع نہ ہو پائے اور غزل کے رسیا عوام حالی کے مقابلے میں داغ کو ، اور اقبال کے مقابلے میں 'لہرا کے پی گیا' والے جگر کی غزلوں کو پسند کرتے رہے ۔ اور کیا قیامت ہے کہ غالب پسندی جب ایک معیاری ذوق کی پہچان اور معیار سا بن گئی ہو اور ایک اتاری بھرا لٹریچر غالب پر لکھا جا چکا ہو ، اُس وقت بھی غالب کے سوچنے اور زندگی پر تبصرہ کرنے والے انداز کو اپنانے والے شعرا (مثلاً شاد عارف) کو زندگی بھر کوئی بھی نہ پوچھے (ایک فراق نے خود ہی مار دھاڑ کے اپنے کو کسی نہ کسی طرح منوا لیا مگر قبولیت عام کا جہاں تک تعلق ہے ، فیض کے مقابلے پر انھیں درجہ نہیں بخشا گیا) ۔ اور سب سے بڑھ کے یہ کہ جدید ترین فکر و تعقل سے آراستہ شاعری کو یکسر شعر سمجھنے ہی سے انکار کیا جاتا ہے !!

یہ سب میں اردو سماج کی بات کر رہا ہوں جس میں غالب اردو کی آبرو سمجھا جاتا ہے ۔ کیا دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب نہیں لیا جائے گا کہ ہم محض حلق کے اوپر سے بات کرنے کے عادی ہو گئے ہیں ، دل سے مکمل خلوص کے ساتھ اور اپنے سارے وجود کو تحلیل کرکے وہ بات بھی نہیں کہہ پاتے جس کے لیے بظاہر جذبے کی آنچ سے پگھلے جاتے ہیں ۔

غالب اردو شاعری کی آبرو ہے ۔ کیوں ہے ؟ کیا ایسی خاص بات ہے اس میں جو دوسروں میں نہیں ؟ شریف شاگرد حالی کو چھوڑیے ، بجنوری کے بعد ، خدا اکرام کا بھلا کرے ، اور کس نے غالب کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے ؟ کتابوں کو جانے دیجیے ؛ غالب پر معیاری مقالوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کچھ اوپر ہی پہنچتی ہے ؛ ان میں ڈیڑھ دو سو نہیں چالیس پچاس مقالے بھی ،

ان چالیس پچاس بلکہ ساٹھ ستر برس میں ، ایسے نہیں ملتے جو غالب کی عظمت کی پہچان کرا سکیں ۔ جنا جان ، استاد عبدالصمد ، حاتم علی مہر ، شعر گوئی کے آغاز کی عمر ، پہلا شعر ، پانچویں غزل ، آخری قصیدہ ، قلمی مرثیہ ، غیرمطبوعہ مثنوی ، غیر معروف رقعہ ، نیا خط ، پرانا مکتوب ، نادر خطوط غالب—غالب کی نانی اور غالب کے ماموں ، پر ہی اچھے اچھے ذہین اسکالر اپنی ساری صلاحیتیں صرف کرتے رہے ۔ کچھ دوسرے نکلے ، انھوں نے غالب کے اردو خطوط ، اردو غزل ، اردو قصیدہ ، غالب کی مثنوی نگاری ، غالب کی مطلع نگاری ، غالب کی مقطع نگاری—اور ایک آدھ نے فارسی غالب کو اپنی جولاں گاہ بنایا ۔ آدھا غالب ، پاؤ غالب ، سوایا غالب ، ڈیڑھ پا غالب ، چھٹانک بھر غالب ، اس طرح تلتا رہا ۔ کسی کے ہاتھ ٹانگ آگئی تو وہ اسی کو غالب سمجھ بیٹھا ۔ کسی کو ناک مل گئی ، کسی کو کان ۔ روسی کے اندھوں میں ہاتھی پہنچ گیا تھا ، اس کے جتنے ہاتھی بنے اس سے زیادہ غالب بنتے چلے گئے ۔ غالب قنوطی ہے ، غالب رجائی ہے ، غالب فارسی اچھی کہتا ہے ، غالب اردو اچھی کہتا ہے ، مثنوی میں غالب یہ کہتا ہے ، اس قصیدے میں اس نے یہ کہا ہے ، غالب عظیم ہے ، غالب جھک مارتا ہے—غالب کی مکمل تصویر کم ہی سامنے آ سکی ۔ فارسی ذوق بتدریج گھٹتے جانے کے سبب اکثر جدید تعلیم یافتہ لوگ جو غالب شناسی کے زیادہ اہل ٹھہرے ، پورے غالب کی تحسین سے عاری رہے ۔ اور قدیم طرز کے غالب شناس چنا جان اور میر مہدی کے چکر میں ایسے پڑے کہ بیس تیس سال میں بھی ان کی قلم سے غالب کی تفہیم کے سلسلے میں کوئی تنقیدی بصیرت رکھنے والا مضمون نہیں نکلا ۔

یہ سب باتیں اس موقعے پر اور اس ناملائم لہجے میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پہلے نہیں تو کم سے کم غالب صدی کے موقع پر ہی ہمیں اپنی بنیادوں کا صحیح صحیح علم تو ہو ہی لے ، تاکہ جائزہ لینے کے بعد ، سمت اور منزل کا تعین کرنے میں زیادہ الجھنیں نہ ہوں ۔ ہوا میں باتیں کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا کرتا ۔

پھر اس وقت ہم غالب کے سلسلے میں کیا ایسے فوری اقدامات کر سکتے ہیں ۔

میری رائے میں سب سے کم وقت میں سب سے زیادہ 'ثواب کا کام' تو یہ ہے کہ غالب کی عظمت کو آشکارا کرنے والے سارے اچھے مقالے یکجا کر دیے جائیں ۔ اور اس 'سارے' لفظ سے آپ ڈریں نہیں ، یہ تعداد مشکل سے اتنی ہی ہوگی کہ دو تین جلدوں میں آ جائے گی ۔

دوسرا اہم کام یہ ہے کہ غالب کے فارسی دیوان کا ترجمہ اردو میں ہو جانا چاہیے - نثر کا کچھ حصہ تو اردو میں منتقل ہو چکا ہے ، بقیہ کوئی ایسا ضروری نہیں ہے -

تیسرے یہ کہ اردو خطوط میں سے تفریحاتی ، لمحاتی ، کاروباری اور محض زور قلم یا زور قابلیت والے حصے خارج کرکے بقیہ کو مضمون وار ترتیب دیا جائے ، اور اسی طرح فارسی اور اردو اشعار کو بھی - اور پھر سب کو ایک جگہ رکھ کے دیکھا جائے کہ : غالب کی کیا تصویر بنتی ہے ؟ غالب کے عہد کی تہذیب کی کس رنگ میں نمائندگی ہوتی ہے ؟ کیا اقدار ہیں جو کم بیش ہوتی جا رہی ہیں ؟ کون سے رنگ ہلکے ہیں اور کون سے گہرے ؟ غالب کے ذریعے عصری تہذیب کا ایک بھرپور مطالعہ کوئی کم اہمیت کی چیز نہیں ہوگا - ضمناً پورا غالب بھی سامنے آتا چلا جائے گا : اس کی پسند نا پسند ، اشیا اور افکار کے بارے میں اس کے رویے اور نظریے ، اس کے مزاج کی علویت اور سفلہ پن ، اس کے فکر کی عظمت اور نیچ پن ، دل کی صفائی اور دل کا چور ، سب کے سب پوری طرح نکھر کے ، واضح ہو کے ، سامنے آ جائیں گے - اس کے بعد سے غالب کو لنگڑا لولا کر کے مطالعہ کرنے کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا — اور پھر جو بھی قلم اٹھائے گا ، پورے غالب پر ہی لکھے گا ، اور اس کا حق بھی ادا کرے گا !

ایک وضاحت اور : مندرجہ بالا تجویز کے تحت اشعار کو مضمون وار ترتیب دینے کے بعد ان کی نثر کرنے کے سلسلے میں کسی لمبی چوڑی شرح کی ضرورت نہیں - اب اتنی بالغ نظری عام ہو چکی ہے کہ محض لفظی معنی کے ساتھ شعر کو نثر میں ڈھال دینا کافی ہوگا ، یعنی دو ایک ناگزیر الفاظ بڑھا دینے ہوں تو بڑھا دیجیے ورنہ محض غالب کے اپنے الفاظ آپ کے لیے کفایت کریں گے کہ مفہوم واضح ہو جائے - حالی کو خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ، شاگردی کا حق ادا کر گئے ہیں - انھی نے غالب کے اشعار کی پہلوداری کا تھیسس بھی پہلی بار جاپا تھا ، جو پھر ایسا جا کہ کسی کو یہ خیال ہی نہیں رہا کہ کسی اچھے شعر میں یہ کوئی خوبی کی علامت نہیں کہ اس کے دو یا تین مطالب ہوں - اس سے تو وہ شعر نہیں محض پینترا ہوکے رہ گیا جس میں خلوص شعری یکسر نہیں ہو سکتا - یہ محض حالی کی طباعی تھی اور اس وقت غالب کو مقبول بنانے کے سلسلے میں منجملہ بعض دوسری باتوں کے یہ بھی ٹھیک ہی تھی ، مگر اب اسے اور نہ چلائیے -

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

غالب کے دو شاگردوں کے متعلق دو سوال

مکرمی و محترمی جناب مالک رام صاحب ایم - اے نے ۱۹۵۷ع میں غالب کے ممتاز شاگردوں کا ایک مبسوط تذکرہ تالیف فرمایا تھا ، جس میں اس شاعر اعظم کے ۱۴۶ تلامذہ کے حالات بہت تلاش اور تحقیق کے بعد مرتب کیے گئے ہیں - جہاں تک معلوم ہے اس کے علاوہ غالب کے شاگردوں کا اور کوئی تذکرہ اس وقت تک شائع نہیں ہوا - اس لحاظ سے ''تلامذۂ غالب'' اپنی حیثیت میں ایک منفرد کتاب ہے اور بے انتہا قابل غور -

اگرچہ فاضل مولف نے اس مبسوط تذکرے کی ترتیب و تالیف میں بے انتہا عرق ریزی اور جان فشانی سے کام لیا ہے اور بڑی تحقیق اور تفحص کے ساتھ حالات کو مدون کیا ہے ، تاہم جیسا کہ ہر تالیف یا تصنیف میں ہوتا ہے ، اس میں بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو کھٹکتی ہیں اور جب تک آن کی تشریح صفائی کے ساتھ نہ ہو ، دل میں برابر کھٹکتی رہیں گی - جہاں تک میں نے ''تلامذۂ غالب'' کا مطالعہ کیا ہے ، دو باتیں میں نے اُس میں ایسی پائیں جن کی تشریح کی فاضل مولف کی طرف سے ضرورت ہے بشرطیکہ وہ یہ تکلیف گوارا فرما سکیں اور اپنی علمی مصروفیات کے باعث ان کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت ہو یا وہ فرصت نکال سکیں -

(۱) پہلا سوال مولوی سیف‌الحق ادیب دہلوی کے متعلق ہے جن کا تذکرہ مالک رام صاحب نے اپنی کتاب میں صفحہ ۲۹ سے صفحہ ۳۲ تک لکھا ہے - اس ذیل میں وہ فرماتے ہیں :

''مولوی سیف‌الحق ادیب ۱۸۳۶ع میں پیدا ہوئے - دہلی کے علما کی خدمت میں رہ کر علوم متعارفہ حاصل کیے - نہایت ذکی‌الفہم تھے اور بہت جلد (علوم مختلفہ میں) طاق ہو گئے - جولانیِ طبع نے شاعری کی طرف مائل کیا اور اصلاح کے لیے غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے - کلام کی آنچ دیکھ کر میرزا نے فرمایا ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات -'' (تلامذۂ غالب ، صفحہ ۳۰)

مگر مالک رام صاحب کے برخلاف خود مولوی سیف‌الحق ادیب اپنے آپ کو مولانا الطاف حسین حالی کا شاگرد بتاتے ہیں اور غالب کا نام بالکل نہیں لیتے ۔ حالی کی شاگردی کا اعتراف مولوی سیف‌الحق ادیب نے اپنے مضامین میں دو مرتبہ کیا ہے جبکہ وہ انجمن مفید عام قصور کی طرف سے شائع ہونے والے ''رسالہ'' کے ایڈیٹر تھے ۔ (الف) پہلی مرتبہ ''رسالہ'' انجمن مفید عام قصور کی جلد ۱ نمبر ۱ بابت جولائی و اگست ۱۸۷۳ء میں اور (ب) دوسری دفعہ ''رسالہ'' مذکور جلد ۱ نمبر ۲ بابت ستمبر اکتوبر ۱۸۷۳ء میں ۔ پس جب ایک شخص خود غالب جیسے قادرالکلام شاعر کو چھوڑ کر اپنے آپ کو حالی کا شاگرد بتا رہا ہے تو لا محالہ ماننا پڑے گا کہ وہ سچ بول رہا ہے اور کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر اُسے سچا کیوں نہ سمجھا جائے ؟

اس اندرونی شہادت کے علاوہ اس سلسلے میں بیرونی شہادت بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ مولوی سیف‌الحق ادیب کے نامور ہم عصر مولانا محمد حسین آزاد دہلوی بھی ادیب کو حالی کا شاگرد بتاتے ہیں ۔ چنانچہ ایک صاحب لالہ دنی چند نامی کو آزاد نے جو خط یکم جولائی ۱۸۷۷ء کو لکھا ہے ، اُس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :

''انجمن قصور میں انوار الحق [1] ادیب تخلص ایک شخص دہلی کا رہنے والا حالی کا شاگرد ایڈیٹر ہو گیا تھا ۔ وہی میرے برخلاف ''پنجابی اخبار'' (لاہور) میں (مضامین) لکھا کرتا تھا ۔ کئی مہینے کے بعد وہاں سے چلا گیا ۔ ماسٹر پیارے لال (آشوب) نے راولپنڈی نارمل سکول کے ہیڈماسٹر کے پاس مترجم کروا دیا تھا ۔''

(مکاتیب آزاد ، صفحہ ۱۴۳ ، شائع کردہ مجلس ترقی ادب ، لاہور)

اگر مولوی سیف‌الحق ادیب میرزا غالب کے شاگرد تھے تو اس کے اظہار میں اُن کو کیا تامل ہو سکتا تھا اور اس کے اخفا کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ خصوصاً جبکہ اُس وقت حالی کی شہرت بہت ہی معمولی تھی اور غالب کی شہرت بام عروج پر پہنچ چکی تھی ۔

اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ ۱۸۶۹ء میں غالب کے انتقال کے بعد مولوی سیف الحق ادیب مولانا حالی سے اصلاح لینے لگے تھے ، تب بھی مولوی سیف‌الحق ادیب اپنے مضمونوں میں غالب کے نام کا اظہار ضرور کرتے کیونکہ حالی بھی تو آخر غالب ہی کے شاگرد تھے ۔ مگر اُنھوں نے اپنے مضامین

۱- آزاد سے نام لکھنے میں یہاں سہو ہوا ۔ دراصل نام سیف الحق ہے ۔

میں دو مرتبہ حالی کی شاگری کا اعتراف کرنے کے باوجود غالب کا نام اشارۃً بھی نہیں لیا ۔

پھر مولانا محمد حسین آزاد بھی جو ہم عصر انشا پرداز ہیں ، ادیب کو غالب کا نہیں بلکہ حالی کا شاگرد لکھتے ہیں ۔ اگر وہ غالب کے شاگرد ہوتے تو آزاد کو اس کے اظہار میں کیا تامل اور عذر ہو سکتا تھا ؟

باقی رہی غالب کے انتقال کے بعد والی بات ، تو خود مکرمی مالک رام صاحب ''تلامذۂ غالب'' میں فرماتے ہیں کہ مولوی سیف الحق ادیب مرزا غالب کے انتقال کے بعد مرزا یوسف علی خاں عزیز کے شاگرد بن گئے تھے ۔ مالک رام صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں :

''مرزا غالب کے بعد چندے مرزا یوسف علی خاں عزیز سے بھی مشورہ کیا ۔'' (تلامذۂ غالب ، صفحہ ۳۰)

لہٰذا یہ بات بھی ٹھیک نہیں بیٹھتی ۔

ان سب امور پر کافی غور کرنے کے بعد بالآخر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ محترمی جناب مالک رام صاحب سے ادیب کو غالب کا شاگرد لکھنے میں غالباً سہو ہوا ، کیونکہ خود ادیب اور آزاد کی شہادتیں اس کے برخلاف موجود ہیں ۔

پھر مولوی سیف الحق ادیب کی تاریخ وفات میں بھی باہم اختلاف ہے ۔ مکرمی مالک رام صاحب ۸ ستمبر ۱۸۹۱ء بتاتے ہیں (تلامذۂ غالب ، صفحہ ۳۰) مگر نظامی بدایونی اپنی مشہورکتاب قاموس المشاہیر میں جون ۱۸۹۱ء لکھتے ہیں ۔ (قاموس المشاہیر ، جلد اول ، صفحہ ۳۲ ، کالم ۱) ۔ اب معلوم نہیں کہ صحیح تاریخ وفات کیا ہے؟ یہ مسئلہ بھی درمیان میں لٹکا رہ گیا ۔

(۲) دوسرا بڑا اہم اور نازک سوال غالب کے ایک دوسرے شاگرد حافظ قاضی عبدالرحمٰن تحسین پانی پتی کے متعلق ہے ۔ محترمی جناب مالک رام صاحب نے ان کے متعلق لکھا ہے :

''یہ اولاد میں تھے حضرت محمد جلال‌الدین کبیر الاولیا کی ۔ ان کے والد کا نام قاضی محمد ثناءاللہ تھا جو پانی پت کے مشہور عالم (اور محدث) گذرے ہیں ۔ علم‌الہدیٰ اُن کا لقب تھا اور تفسیر مظہری اُن کی مشہور کتاب ہے ۔'' (تلامذۂ غالب ، صفحہ ۶۱)

میں اس موقع پر نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ اپنے فاضل دوست مالک رام صاحب سے اختلاف کی جسارت کرتا ہوں ۔ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ قاضی عبدالرحمٰن تحسین ، حضرت مخدوم شیخ جلال الدین کبیر الاولیا رحمۃاللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے (اور حضرت قاضی ثناءاللہ محدث پانی پتی بھی حضرت

مخدوم کبیر الاولیا کی نسل سے ہیں) لیکن یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں کہ قاضی عبدالرحمٰن تحسین حضرت قاضی ثناء اللہ محدث پانی پتی کے لڑکے تھے ۔ حضرت قاضی ثناءاللہ کا فرزند ہوتا تو الگ رہا اُن کی اولاد میں سے بھی کسی شخص کا نام عبدالرحمٰن نہیں تھا ۔ حضرت قاضی ثناءاللہ محدث پانی پتی کے بیٹوں اور بیٹیوں کے نام یہ ہیں : سعیدالنساء ، نشاط بیگم ، مولوی حجۃ اللہ ، مولوی احمداللہ ، مولوی دلیل‌اللہ ۔

اگرچہ قاضی ثناء اللہ اور قاضی عبدالرحمن دونوں ایک ہی خاندان کے فرد ہیں اور دونوں حضرت مخدوم جلال‌الدین کبیرالاولیاء کی اولاد میں سے ہیں مگر عبدالرحمن کے والد کا نام قاضی ثناء اللہ نہیں تھا ۔ ان کے والد کا نام عبدالہادی تھا ۔ عبدالہادی کے سات بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں : عبد الکریم ، عبد الخالق ، عبدالواحد ، عبدالرشید ، عبدالعزیز ، عبدالرحمن تحسین اور عبدالحق ۔ عبدالرحمن تحسین کے کوئی لڑکا نہیں ہوا اور وہ لاولد فوت ہو گئے[1] ۔ تحسین کے بھائی عبدالحق کے فرزند شریف‌الحق کے لڑکے عزیزالرحمن ہیں ۔ جو آج کل جھنگ مگھیانہ میں سکونت پذیر ہیں ۔ ان کے پاس قاضی عبدالرحمن تحسین کا دیوان قلمی حالت میں موجود ہے ۔ عبدالرحمن تحسین مولانا حالی کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے ۔ ان کے نام مولانا کے دو فارسی خط بھی مولانا کے عربی و فارسی کلام کے مجموعے میں شامل ہیں ۔ جن کو میں نے کلیات نثر حالی جلد سوم میں درج کیا ہے ۔ تحسین کا انتقال اپنے استاد کی وفات کے ۹ سال بعد ۱۸۷۷ع میں ہوا ۔

میرا مقصد مالک رام صاحب پر اعتراض کرنا یا ان کے کام میں نقص نکالنا ہرگز نہیں بلکہ ان کی قابل قدر تالیف کو مطالعہ کرتے ہوئے جو بات میرے دل میں کھٹکی ، اسے میں نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا : ع

مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

۱۔ پانی پت کے ایک بزرگ، محمد مسیح اللہ عثمانی سرگودھا کے بلاک نمبر ۲۳ میں رہتے ہیں ۔ ان کے پاس پانی پت کے تمام بزرگوں کے قدیم شجرہ ہائے نسب اور ان کے حالات کا بہت بڑا قلمی ذخیرہ محفوظ ہے ۔ جو صاحب اس معاملے میں مزید تحقیق کرنا چاہیں ، وہ ان سے خط و کتابت فرمائیں ۔ میں نے بھی جو کچھ بیان کیا ہے ، وہ ان ہی سے لے کر لکھا ہے ۔

از ڈاکٹر لئیق بابری

غالب کے پانچ اشعار

فرانسیسی میں ترجمہ

CINQ VERS DE GHALIB

(Traduits de l'urdu)

par

Dr. Laeeq Babree

1

Déployé au dessus de mon nid
Fut un filet sinistre.
J'étais pris, hélas,
Avant de prendre mon vol.

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

2

Ne suis-je pas un oiseau
Prisonnier dans une cage
Qui ramasse des pailles
Pour son nid ?

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

3

Laissez, laissez couler
Le fleuve de sang
Ce soir, l'angoisse de l'amour
Change mes deux yeux
En chandelles vivantes.

جوے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

4

Ma tête sous la reine de folie
Pèse sur mes épaules.
N'y a-t-il pas, Seigneur,
Dans le désert
Un mur où la cogner ?

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

5

Dans la prison toujours
Le même souvenir de tresses
De mon amour,
S'ajoute à la peine
Des lourdes chaines.

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

ایم اسلم

غالب کے اشعار پر نثری تضمین

دوست !
بس ایک آرزو ہے
اور ایک ہی تمنا
زندگی !
زندگی کا جوار بھاٹا بھی دیکھا
دھوپ اور چھاؤں بھی دیکھی
بس ایک آرزو ہے
ایک ہی تمنا
ایک گھر یا کٹیا
لیکن جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں
اپنی کٹیا یا اپنا گھر
اور گذرنے والے اُنگلی اُٹھا کر کہیں
یہ اس کا گھر ہے
جو دنیا سے بیزار رہا
میرا گھر اس وادی میں ہو
جو انسان کے نقش پا سے نا آشنا ہو
میری کٹیا اس وادی میں ہو
جو اونچے اونچے ، خاموش پہاڑوں کی آغوش میں
آسودۂ خواب ہو
سورج کی اُجلی اُجلی دھوپ میں
اور بادلوں کے رومانوی سائے میں
عشق اور محبت
فطرت کے دلچسپ کھیل کھیلتے ہوں

میرا گھر اس وادی میں ہو
جو انسان کی زبان کے زہر سے پاک ہو
وہ زہر
جو سانپ کے زہر سے مہلک اور
دشمن کی تلوار سے بھی خطرناک ہوتا ہے
تلوار کا گھاؤ تو مندمل ہو جاتا ہے
لیکن زبان کا گھاؤ
زندگی کو تلخ کر دیتا ہے
میرا گھر ان گل بداماں رمنوں میں ہو
جہاں دل کے نازک اور خوبصورت آبگینے میں
صہبائے محبت اس طرح چھلکتی ہو
جیسے ہرن کی آنکھ میں مستی
یا کبک کی آواز میں پیار کا پیغام
اور ہر آرزو اس طرح سبک سار ہو
جیسے موج یم دریا کے سینے میں
یا بچہ ماں کی آغوش میں بے فکر
تقدیر پر رونے والے آنسو
شب کے تاروں کے لیے پیغام رشک ہوں
اور زندگی
فطرت کی پلکوں کے سائے میں
آسودہ اور مطمئن
میرا گھر اس نغمہ در آغوش وادی میں ہو
جہاں دوشیزۂ فطرت کے گیت
زندگی کو حیات تازہ سے آشنا کریں
اور آہ کی خاموش پرواز
حصار دل سے پار نہ ہو
جہاں زندگی کی ہم سفر میری قسمت ہو
جس سے مجھے نہ شکوہ ہو نہ گلہ
میرے دوست !
اس حسین اور دلکش وادی میں
فطرت مجھ سے آنکھیں لڑائے

میں فطرت سے آنکھیں لڑاؤں
ستارے مسکرائیں
اور چاند ہالے کے گھونگھٹ میں شرمائے
اور مجھے ایک ہی آرزو ہو
ایک ہی تمنا
یعنی ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

سہ ماہی صحیفہ کے گزشتہ شمارے

شمارہ ۹ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲ ، کا کوئی نسخہ سٹاک میں نہیں ،
باقی پرچے محدود تعداد میں برائے فروخت موجود ہیں ۔

صحیفہ
مجلس ترقیِ ادب ، کلب روڈ ، لاہور

سید امتیاز علی تاج

غالب اور آن کی بیگم

دیوان غالب میں سے ایک شعری مکالمہ

[سامنے کی دیوار میں کھڑکی - دائیں اور بائیں ہاتھ دیوار کے اگلے حصے میں دروازے - بائیں ہاتھ پچھلے حصے میں دیوز کے ساتھ پلنگ - دائیں ہاتھ کی دیوار میں کپڑے ٹانگنے کی کھونٹی جس پر علاوہ دوسرے کپڑوں کے برقعہ ٹنگا ہے - اس سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ اگا ہوا تخت جس پر سوزنی بچھی ، گاؤ تکیے اور پاندان رکھا ہے - پردہ اُٹھتا ہے تو بیگم غالب پلنگ پر اداس لیٹی ہیں] -

بیگم : (آہ بھر کے مضمحل انداز میں اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں ، ذرا سے توقف کے بعد) ؎

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے ، مرا تن بارِ بستر ہے

(اُٹھتی اور سست قدموں سے کھڑکی تک جاتی اور اُس کے پٹ بند کرکے درز میں سے باہر جھانکتی ، پھر سر دیوار سے ٹیک لیتی ہیں - چند لمحوں کی خاموشی کے بعد آہ بھر کر) ؎

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

(غالب بائیں ہاتھ کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں) -

غالب : (بیوی کو دیکھے بغیر) ؎

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

بیگم : (غالب کو دیکھ کر شکوہ آمیز انداز میں) ؎
حزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں ، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

غالب : (بیوی کو دیکھ کر جغہ اُتارتے ہوئے) ؎
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
رہبر قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

بیگم : ؎
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب : (کھونٹی کی طرف بڑھتے ہوئے) ؎
مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

بیگم : ؎
بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے !

غالب : (جغہ اور ٹوپی کھونٹی پر ٹانگتے ہیں) ؎
آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ تحریر میں آئے

بیگم : (جیسے بوجھ کر) ؎
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس ؟
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے ؟

غالب : (تخت پر بیٹھ جاتے ہیں) ؎
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

بیگم : ؎
ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

غالب : (بے بسی کے تبسم کے ساتھ) ؎
یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

بیگم : ــــہ

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم ، کیا ہے

غالب : (دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لیتے ہیں) ــــہ

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

بیگم : ــــہ

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

غالب : ــــہ

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

بیگم : ــــہ

در پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

غالب : (اُٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) ــــہ

حسد سے دل اگر افسردہ ہے ، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بیگم : ــــہ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو ؟

غالب : (کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) ــــہ

اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

بیگم : ــــہ

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

غالب : ؎

چال جیسے کڑی کمان کا تیر

(بڑھ کر اور تالیف قلب کے لیے ہاتھ تھام کر)

دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بیگم : (گوشۂ چشم سے آنسو پونچھتے ہوئے) ؎

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ طوفانِ اشک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

غالب : (تخت پر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے) ؎

جان تم پر نثار کرتا ہوں

میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

بیگم : (غالب کی سلیم الطبعی سے بپھر کر) ؎

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالب : ؎

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

بیگم : (ابھی دل نہیں بھرا) ؎

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے

چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

غالب : (ہاتھ بیگم کے پرلے کندھے پر رکھ کر) ؎

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہ گار ہوں ، کافر نہیں ہوں میں

بیگم : (ابھی آنسوؤں کا حربہ باقی تھا) ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار ، کوئی ہمیں رلائے کیوں

غالب : ؎

خدایا ! جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

بیگم : ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

غالب : ؎

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
لیکن اب کے سرگرانی اور ہے

بیگم : (آہِ دلدوز کے ساتھ) ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب : ؎

جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

بیگم : (بگڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی ہیں) ؎

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

غالب : ؎

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو ، کشاکش درمیاں کیوں ہو ؟

بیگم : (شہیدانہ انداز میں) ؎

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی ؟

غالب : (سمجھانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھنا چاہتے) ؎

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

بیگم : (ہاتھ چھڑا کر) :

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

غالب : (مایوس ہو کر) ؎
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں
(بر افروختگی میں جا کر چغہ کھونٹی سے اُتارتے ہیں) ؎
رہیے اب ایسی جگہ جا کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
(چغہ پہنتے ہوئے) ؎
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
(ٹوپی پہنتے ہوئے) ؎
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
(جوش میں تیزی سے باہر نکل جاتے ہیں)

بیگم : (اپنے طرزِ عمل پر نادم ہو کر اپنے آپ سے) ؎
بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
(تیزی سے کھڑکی کی طرف جاتی اور بے اختیاری میں پٹ کھول کر)
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا!
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے
(بے قراری سے واپس آتی اور احساسِ جرم کے خوف میں کھونٹی پر سے برقعہ اتارتی ہیں)۔
اسد ہے نزع میں، چل بے وفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے
(غالب خود واپس آ جاتے ہیں، بیگم برقع پہن رہی ہیں)

غالب : (اپنے آپ سے) ؎
فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

بیگم : (غالب کو دیکھتی، اُن کی طرف بڑھتی اور پشیمانی کے عجز سے) ؎
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

غالب : (بیگم کے انداز سے حوصلہ پا کر شوخی سے) ـــــ

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

بیگم : (مسکرا کر) ـــــ

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

(دونوں محبت سے ایک دوسرے کے دونوں ہاتھ تھامتے ہیں)

پردہ

أردو ادب کا پہلا ڈائجسٹ

ماہنامہ **نقش** کراچی

ہر ماہ پاک و ہند کے أردو رسائل سے معیاری انتخابات پیش کرتا ہے
جنگ نمبر اور خواتین افسانہ نمبر کے بعد
أردو کے عظیم المرتبت شاعر مرزا غالب
کی صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ع میں نقش مرزا غالب کے بارے میں
بہترین تحریروں کا ایک جامع انتخاب پیش کر رہا ہے -
قیمت عام شمارہ ۱٫۵۰ - سالانہ قیمت ۱۵ روپے

کاشانۂ أردو

۶/۲ ، اکبر روڈ صدر کراچی نمبر ۳
پوسٹ بکس نمبر ۷۳۰۲ - فون نمبر ۷۰۱۵۶

رفتار ادب

(کتابوں پر تبصرے)

کلیاتِ ظفر مرتّب : عمر فیضی - صفحات : ۳۳۴ - مجلد ، رنگین گرد پوش - قیمت : پندرہ روپے - ناشر : سنگ میل پبلیکیشنز چوک اردو بازار لاہور نمبر ۲ -

کلیات ظفر کی ترتیب و اشاعت یقیناً آج کے ادب میں ایک اہم ضرورت ہے - انتخابِ کلامِ ظفر تو پھر بھی کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں لیکن کلیات تقریباً نایاب تھی - اس طرح اس کتاب کو شائع کر کے مرتّب نے ایک مفید کام کیا ہے - 'پیش لفظ' میں مرتب نے ظفر کے ذاتی اور سیاسی حالات پر روشنی ڈالی ہے جو ان کی شاعری میں پس منظر کے طور پر آتے ہیں - اس کے بعد انھوں نے آزاد کی اس رائے کو غلط ثابت کیا ہے کہ ظفر کا کلام ذوق کا کلام ہے - آزاد کی اس رائے کی تردید تو مجموعی طور پر تمام نقادوں نے کر دی ہے لیکن مرتب نے اس ضمن میں ظفر کو زیادہ بڑھانے کے لیے ذوق کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی رگیدا ہے - مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :

"...دونوں کے یہاں شاہ نصیر کی طرح سنگلاخ زمینیں ملتی ہیں مگر ظفر کو قافیہ اور ردیف کو نبھانے پر جو قدرت حاصل ہے ، وہ ذوق کو میسر نہیں[1] ....." (کلیات ظفر ، صفحہ ۸)

حالانکہ ذوق ایک مسلّم استادِ فن ہے - ان کی فنی پختگی کا اثر ضرور ظفر کے ہاں موجود ہے لیکن یہ کہنا کہ ذوق فن کے لحاظ سے ظفر سے کم تر تھے ، زیادتی ہے - اس سلسلے میں یہ اقتباس دیکھیے :

"یہ تو ظاہر ہے کہ فنی اعتبار سے ذوق کا کلام بہ حیثیت مجموعی ظفر کے کلام پر فائق ہے - جہاں تک ندرت آفرینی ، پختگی بیان اور عالمانہ وسیع النظری کا تعلق ہے ، ذوق کا دیوان استادی کا درجہ رکھتا ہے اور ظفر ان کے شاگرد ہی قرار پاتے ہیں[2] -"

۱- کلیات ظفر مرتبہ عمر فیضی ، صفحہ ۸ -

۲- انتخاب ذوق و ظفر ، مرتبہ پنڈت برج موہن دتا ترپہ کیفی و شان الحق حقی ، ص ۷۵ -

اور حقیقت یہی ہے کہ فن کے اعتبار سے ذوق کو ظفر پر فوقیت حاصل ہے ۔ اگرچہ ندرت خیال اور دیگر داخلی خصوصیات شاعری میں ظفر ذوق پر حاوی ہیں ۔ لیکن مرتّب نے 'پیش لفظ' میں دونوں شاعروں کے متعلق رائے قائم کرنے میں یقیناً انتہا پسندی کا ثبوت دیا ہے ۔ حالانکہ شاعروں کے درجے حساب کتاب کے پیمانوں سے متعین نہیں کیے جاتے ۔ مرتّب جگہ جگہ ایسے قطعی فیصلے کرتے نظر آتے ہیں ۔ مثلاً : (کلیات ظفر ، صفحہ ۱۱)

''......بہر حال تمام تر استادی کے باوجود ہم انہیں (ذوق کو) اچھا غزل گو قرار نہیں دے سکتے[۱] ۔''

یہاں انہوں نے ''اچھا غزل گو'' قرار نہ دے کر ذوق کو دوسرے درجے کے شاعروں سے بھی نیچے گرا دیا ہے ۔ وہ ذوق کو بہت اچھا غزل گو نہ سہی اچھا غزل گو ماننے سے بھی انکار کرتے ہیں ۔

''اس کا (کلیات ظفر کا) سرسری مطالعہ بھی یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ غالب و مومن کے دور میں تیسرا بڑا غزل گو صرف ظفر ہی ہے ۔ ذوق کا شاعرانہ مرتبہ اس سے بہت کم ہے[۲] ۔''

اس انتہا پسندی اور رائے کی قطعیت کے باوجود قابل ذکر بات یہ ہے کہ کلیات کا شائع ہونا ادب کی اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے ۔

کتاب اخباری کاغذ پر چھاپی گئی ہے ۔ اس اعتبار سے اس کی قیمت پندرہ روپے یقیناً زیادہ ہے ۔ (نسرین کوثر)

محترم | مصنف : محمد طفیل ۔ صفحات : ۱۵۰ ۔ مجلد ، خوبصورت گرد پوش ۔ قیمت : چار روپے ۔ پبلشر : ادارہ فروغ اردو لاہور ۔

طفیل صاحب مدیر 'نقوش' کے علاوہ ''صاحب'' ، ''آپ'' اور ''جناب'' کے مصنف بھی ہیں ۔ وہ شخصیت نگاری کے فن میں مقام پیدا کر چکے ہیں ۔ زیر نظر کتاب میں ہمیں ان تینوں کتابوں پر کچھ اضافہ بھی ملتا ہے۔ یعنی اس میں شخصیت نگاری ہی نہیں ، اس کے ساتھ ساتھ سفر نامہ (جو رپورتاژ ہے مگر مصنف نے اسے سفر نامہ لکھا ہے) اور تاریخ بھی موجود ہے ۔ تینوں کے حسین امتزاج سے طفیل صاحب نے ایک نئے نثری تجربے کی بنیاد رکھی ہے ۔ ان کے لیے شخصیت نگاری کا میدان نیا نہیں ۔ اس میں انہیں گہری دل چسپی ہے ۔

۱۔ کلیات ظفر ، صفحہ ۱۱ ۔
۲۔ کلیات ظفر صفحہ ۱۲ ۔

ان کی شخصیت نگاری زیادہ تر ان کے شگفتہ اسلوب کی وجہ سے ہے ۔ چند لفظوں یا چند جملوں میں پوری شخصیت کو بیان کرنا ان کا خاصہ ہے ۔ انداز بیان کی شوخی کے ساتھ جب مصنف کی بےباکی شامل ہوتی ہے تو اس کا اثر دیدنی ہوتا ہے اور شخصیت کے خط و خال زیادہ نکھر آتے ہیں ۔ جمیل الدین عالی کے بارے میں لکھتے ہیں (صفحہ ۱۲۳) :

''ڈکٹیٹرانہ شان رکھنے والے مگر مصلحت آمیزی میں طاق ، معاملہ فہم مگر ضد کے بادشاہ ، مخلص اتنے کہ مسکرا مسکرا کر وجھا دیں ۔ جانبدار اتنے کہ اصول شرما جائیں ۔ رائٹرز گلڈ کے ناخدا مگر خود گلڈ کی دریافت ۔''

صہبا لکھنوی کے متعلق رقم طراز ہیں :

''ان کی صحت دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے جی رہے ہیں ۔ جب یہ باتیں کرتے ہیں تو پھر مخاطب کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیسے جی رہا ہے'' (صفحہ ۴۹) ۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی شخصیت دیکھیے :

''اتنے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود خالص سندھی نظر آتے ہیں...... یہ مسکراتے بھی بہت ہیں مگر ہر جگہ ان کے مسکرانے کے معنی مختلف ہوتے ہیں'' (صفحہ ۳۴) ۔

''ہم میں زیادہ لڑنے اور جھک جھک کرنے والے دو آدمی ہیں ؛ ایک صہبا لکھنوی ، دوسرے ہمارے وکیل ریاض انور'' (صفحہ ۶۲) ۔

شخصیت نگاری میں وہ تنقید کے ساتھ طنز کا حربہ بھی استعال کرتے ہیں جس سے شگفتگی پیدا ہوتی ہے ۔ مثلاً :

''یہ ریڈیو کے اتنے بڑے عہدیدار ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا شریف آدمی یہاں تک کیسے پہنچا'' (صفحہ ۹۶) ۔

''پھر یہاں تو معاملہ 'یو ۔ پی' اور 'پنجابی' کا بھی تھا ۔ وہ مضمون میں نے پڑھا جسے شاہد صاحب نے بڑا سنبھل سنبھل کر لکھا ہوا تھا ۔ میرا خیال نہ تھا کہ شاہد صاحب کبھی بھی اپنی مرضی کے خلاف کچھ لکھیں گے مگر یہ مضمون لکھا'' (صفحہ ۱۳۴) ۔

یہ کتاب جو بظاہر سفر نامہ معلوم ہوتی ہے ، درحقیقت رپور تاژ ہے کیونکہ سفرنامہ واقعات کا ایک سیدھا سادا اور غیر جذباتی بیان ہوتا ہے اور رپور تاژ میں مصنف کے ذاتی تاثرات بھی شامل ہوتے ہیں ۔ اس اعتبار سے ہم اسے رپور تاژ ہی کہیں گے ۔ رپور تاژ کی تکنیک کے علاوہ اس میں شخصیت نگاری بھی شامل ہے ۔ یہ ایک ایسا سفر ہے جس میں شریک ہر انسان کی پوری شخصیت مختصر مگر

جامع انداز میں ہمارے سامنے آ جاتی ہے ۔ واقعات کی جزئیات بھی اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہیں ۔

رپورتاژ اور شخصیت نگاری کے ساتھ ساتھ اس میں تاریخ بھی شامل ہے ۔ طفیل صاحب مشہور سندھی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس کے موقع پر لاہور سے حیدر آباد اور وہاں سے کراچی تک سفر کرتے رہے ۔ اسی سفر کے واقعات بیان کرتے ہوئے سندھ کی مختصر تاریخ ، شاعر کی ذاتی زندگی اور کلام کے متعلق ضروری معلومات بھی بہم پہنچائی گئی ہیں اور یہ اچھی علمی واقفیت ہے ۔

ہمارے ہاں شخصیت نگاری میں جانب داری اور مصلحت اندیشی اِسے بہت کم لوگ دامن بچا سکے ہیں ۔ جنھوں نے ان دونوں چیزوں سے شعوری طور پر انحراف کیا ہے ، وہ غیر شعوری طور پر شخصیت پرستی کی زد میں آ گئے ۔ طفیل صاحب غیر جانب‌داری اور غیر مصلحت پسندی کے علم‌بردار ہیں اور یہی چیز فن میں انفرادیت کا ثبوت ہے ۔ کتاب میں غیر مصلحت پسندی کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے :

''رائٹرز گلڈ کا قیام کیا عمل میں آیا ، بیشتر دوستوں کے دماغ اپنی اصلی سطح سے اونچے ہو گئے'' (صفحہ ۱۲۱) ۔

''بڑے متحمل مزاج ، بڑے بردبار ، بڑے استغناپسند ، مگر جب معاملہ سندھی زبان کا آ جائے یا سندھ کے کسی مسئلے کا تو نہ یہ برد باد ، نہ متحمل مزاج ، نہ استغنا پسند ، پھر تو یہ قدرے خطرناک آدمی بن جاتے ہیں'' (صفحہ ۴۳) ۔

شخصیت نگاری کے علاوہ بھی جس چیز یا موقع کے متعلق وہ کچھ سوچیں یا محسوس کریں ، بلا جھجک بیان کر دیتے ہیں ۔

''اردو جو لال قلعے کی زبان ہے ، اسے آج مغربی پاکستان کے گلی کوچوں کی زبان بننا ہو گا ورنہ——ورنہ اس ڈولی کا بوجھ ہمارے کندھے سہار نہ سکیں گے'' ۔ (صفحہ ۱۱۰)

''میرا وہم ہے کہ گلڈ ایک ایسا ادارہ ہے جو صرف چند دوستوں کو نوازنے اور باقی سب کو ٹرخانے کے لیے بنایا گیا ہے ۔ اصول کوئی نہیں ، للّٰہی دوستی ، للّٰہی دشمنی'' (صفحہ ۱۰) ۔

''قواعد کی رو سے زبان بندی ہے ، تعمیری تنقید بھی کھلے بندوں جرم ہے'' (صفحہ ۱۰) ۔

ان خصوصیات کی بنا پر یہ کتاب اردو ادب میں نئی چیز ہے ۔ (نسرین کوثر)

ولی سے اقبال تک | تالیف : ڈاکٹر سید عبداللہ ، طبع سوم ، صفحات تقریباً پانچ سو ، قیمت آٹھ روپے ، ناشر مکتبۂ خیابان ادب ۳۹ چیمبرلین روڈ لاہور ۔

"ولی سے اقبال تک،" ڈاکٹر سید عبداللہ کا مجموعۂ مضامین پہلی بار ۱۹۵۸ء میں چھپا تھا جس میں کلاسیکی اُردو شاعری اور شعرا پر بارہ مضامین شامل تھے ۔ ولی ، میر ، اثر ، نسیم ، آتش ، مصحفی ، ناسخ ، غالب ، داغ اور اقبال—ان مضامین نے تحقیق و تنقید کے میدان میں نئی راہیں سجھائیں جس کا اعتراف بھی ہوا ۔ اقبال پر مضمون تو خود علامہ اقبال سے داد لے چکا ہے ۔ یہ مضامین اُردو شاعری کی مربوط تاریخ تو پیش نہیں کرتے لیکن ان میں ایک تسلسل ضرور موجود ہے ۔ تاہم بعض خلا ایسے تھے جو اس تسلسل کو بُری طرح متاثر کرتے تھے ۔ مثلاً کلاسیکی شعرا میں مرزا رفیع سودا ، خواجہ میردرد ، مومن اور حالی کی عدم موجودگی بہت کھٹکتی تھی ۔ یہ خلا دوسرے ایڈیشن میں بھی پُر نہ ہوسکا ۔ تیسرے ایڈیشن (زیر تبصرہ) میں نہ صرف یہ خلا دور کیا گیا ہے بلکہ کچھ اور نئے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں جن کی وجہ سے یہ مجموعہ اب مسلسل اور ایک حد تک مربوط انداز میں اُردو شاعری کی تاریخ پیش کرتا ہے ۔

پرانے مضامین میں جمال دوست ، اُسلوب پرست ولی ، اُردو مثنوی کا دکنی دور ، کلام میر میں فکر و نظر کا عنصر ، خواب و خیال—ایک عجیب مثنوی ، گلزار نسیم ، خواجہ آتش—محض مرصع ساز یا شاعر بھی ؟ مصحفی کا کارنامۂ خاص اُردو شاعری میں ، ناسخ کی منسوخ شاعری ، غالب کی غزل ، مرزا غالب کا حاسۂ انتقاد ، داغ کا اشک غم—شہر آشوب دہلی ، اقبال کا سیاسی تفکر ، شامل ہیں ۔ تازہ مضامین میں سودا کی غزل ، درد کا صوفیانہ لب و لہجہ ، غالب—دو زبان شاعر ، کلام مومن ، حالی—شاعر اور سوانح نگار ، اُردو نظم—وضاحت سے علامت تک ، شامل کیے گئے ہیں ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ملک کے نامور محقق اور نقاد ہیں ۔ اُن کے یہ مضامین برسوں کی سوچ کا نتیجہ ہیں ۔ وہ جس شاعر کے بارے میں لکھتے ہیں ، اُس کے ساتھ ذہنی مفاہمت اور کبھی کبھی روحانی رفاقت قائم کر کے اور اُس دور کی تہذیبی روح میں ڈوب کر لکھتے ہیں ۔ اُردو شاعری میں صوفیانہ افکار کے بارے میں نقادوں کے خیالات بڑے سرسری رہے ہیں ۔ خواجہ میر درد کو عام طور پر صوفیانہ اُردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا رہا ہے ۔ ان کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت بھی متعین نہیں کی گئی ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ولی اور درد کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت بھی متعین کی ہے اور اُردو کے ان دو بڑے صوفی شاعروں کے زاویہ ہائے نظر کو بھی واضح کیا ہے ۔ میر تقی میر سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی ذہنی و روحانی رفاقت مسلّم ہے ۔ زیر تبصرہ تالیف میں میر تقی میر پر مضمون نہ صرف میر کے فکر و نظر کا بھرپور جائزہ ہے بلکہ محمد شاہی عہد

کی ثقافتی روح کو سمجھنے کی ایک بلیغ کوشش بھی ہے ۔ میر سے اس ذہنی اور قلبی لگاؤ کے باوجود انھوں نے اس عہد کے دوسرے بڑے نمائندے مرزا رفیع سودا کی غزل کا بھی منصفانہ جائزہ لیا ہے ۔ ہر شخص کا اپنا ایک لہجہ ہوتا ہے ۔ اس لہجے اور آواز کے پیچھے شخصیت کا عصبی نظام اور نفسیاتی عمل اور رد عمل کار فرما ہوتا ہے ۔ اس امر کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ صورت پیدا ہوتی ہے جو اُردو شاعری میں عام موازنے و مقابلے کی صورت میں ملتی ہے ۔ میر اور سودا کی معاصرانہ چشمک اور اس سلسلے میں قدیم تذکرہ نگاروں اور بعض جدید نقادوں کی اختلافی آرا اور موازنے و مقابلے کی صورتیں اُردو کے ان دو عظیم فن کاروں کے صحیح مرتبے و مقام کو متعین کرنے میں ہمیشہ حائل رہی ہیں ۔ خصوصاً جدید دور کی میر پرستی نے سودا کی غزل کو تو بھلا ہی دیا تھا ۔ سودا جیسے خوش باش اور ہشاش بشاش انسان سے میر جیسے افسردہ اور پُرسوز لہجے کی توقع عبث ہے ۔ سودا اپنی توانا آواز اور جوش انگیز لہجے کی وجہ سے غزل میں (میر کے مقابلے میں) مختلف لب و لہجے کے نمائندہ ہیں ۔ اس لیے ان فن کاروں کا مقابلہ کرنے کی بجائے زندگی کے ان رویوں کو سمجھنا ضروری ہے جن کی نمائندگی یہ فن کار کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسی نقطۂ نظر سے سودا کی غزل کا جائزہ لیا ہے ۔

مصحفی ، آتش اور ناسخ کے فن کے بارے میں بھی آرا کا اختلاف خاصا شدید رہا ہے ، شاید اس لیے کہ تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے ان شعرا کے فن کو اُن کے عصر کی تہذیبی روح کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش ذرا کم کی ہے ۔ مصحفی اُس دور کے نمائندے ہیں جب دلی کی بستی ویران ہو چکی تھی اور لکھنؤ کی تہذیب اپنے نقش و نگار سنوار رہی تھی ۔ آتش و ناسخ کے زمانے میں یہ نقوش بہت نمایاں ہو چکے تھے ۔ لکھنؤ کی اس تہذیبی فضا کے آئینے میں جب ہم ان شعرا کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی صحیح قدر و قیمت بہت حد تک واضح ہو جاتی ہے ۔ مصحفی ، آتش اور ناسخ پر ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضامین اس نقطۂ نظر سے بڑے فکر انگیز ہیں اور لکھنؤ کی تہذیبی روح کے خوشگوار پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ۔

''ولی سے اقبال تک'' کے پہلے دو ایڈیشن لیتھو میں چھپے تھے ۔ اب یہ تیسرا ایڈیشن تازہ مضامین کے اضافے کے ساتھ خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے ۔ جدید اُردو ٹائپ پریس نے دیدہ زیب طباعت کے علاوہ صحت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے ، زیر تبصرہ کتاب اس پر پوری اُترتی ہے ۔

نوابی دربار تالیف : نواب سید محمد آزاد (۱۸۴۶—۱۹۱۶ء)، مرتبہ ممتاز منگلوری۔ طبع : نومبر ۱۹۶۶ء ، ٹائپ ، کاٹرج کاغذ ، صفحات ۱۲۸ - پلاسٹک کور ، قیمت ساڑھے تین روپے - ناشر : مکتبۂ خیابان ادب ، ۳۹- چیمبرلین روڈ ، لاہور۔

نواب سید محمد آزاد انیسویں صدی کے مشہور اُردو ادیب اور مزاح نگار تھے جن کے مضامین اُردو کے مشہور مزاحیہ رسالے "اودھ پنچ" میں چھپتے رہے - "خیالات آزاد" اُن کے مختلف النوع مزاحیہ مضامین کا نایاب مجموعہ تھا جسے مکتبۂ خیابان ادب اس سے قبل پیش کر چکا ہے - "نوابی دربار" نواب سید محمد آزاد کی مشہور تصنیف ہے جو ۱۸۷۸ء میں "اودھ پنچ" میں شائع ہوئی - دوسری بار پروفیسر عبدالغفور شہباز نے ۱۹۰۱ء میں اسے کتابی صورت میں چھاپا - "نوابی دربار" ایک عرصے سے نایاب تھی اور محققین اور نقاد اس کے بارے میں محض قیاس آرائیوں سے کام لے رہے تھے - عام طور پر اسے ناول کہا جاتا رہا ہے - اب ممتاز منگلوری نے اسے مرتب کیا ہے اور مکتبۂ خیابان ادب نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے - "نوابی دربار" اُردو کا پہلا نثری ڈراما ہے جس میں نواب سید محمد آزاد نے بڑے پُر لطف انداز میں لکھنئو کے زوال پذیر نوابوں اور اُن کے مصاحبوں کو پیش کیا ہے - "نوابی دربار" میں زوال آمادہ تمدن اور معاشرت کے جیتے جاگتے کردار دکھائے گئے ہیں جو قاری کے لیے ہنسنے کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں اور عبرت کا نقشہ بھی پیش کرتے ہیں - امانت سے آغا حشر تک اُردو ڈرامے میں نثر سے زیادہ نظم کی بھرمار رہی - لیکن "نوابی دربار" اس طویل سلسلے میں ایک ایسا ڈراما ہے جس میں نظم کا سہارا نہیں لیا گیا - سادہ و سلیس لیکن برجستہ مکالموں کے ذریعے کہانی آگے بڑھتی ہے - کرداروں کے نفسیاتی عمل اور رد عمل کو بھی بڑی مہارت سے پیش کیا گیا ہے - شروع میں مرتب نے ایک مفید مقدمہ لکھ کر "نوابی دربار" کی فنی و ادبی قدر و قیمت بھی متعین کی ہے جس سے اُردو ادب خصوصاً ڈرامے کی تاریخ میں اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے - اگر مرتب اس کے ساتھ ایک فرہنگ بھی دے دیتے تو اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

دید و دریافت تالیف : نثار احمد فاروقی ، اشاعت ۱۹۶۴ء ، طباعت لیتھو ، قیمت ۳/۷۵ ، ناشر : آزاد کتاب گھر ، کلاں محل ، دہلی نمبر ۶ -

"دید و دریافت" نثار احمد فاروقی ، استاد عربی و فارسی ، دہلی یونیورسٹی کے ۹ تحقیقی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے : ۱- اُردو میں خاکہ نگاری - ۲- مولوی

مدن کی سی - ۳ - قائم چاند پوری - ۴ - آفتاب ہند - ۵ - پریم چند - ایک عہد ساز ادبی شخصیت - ۶ - نئی اُردو تنقید - ۷ - تنقید مرآۃ الشعراء - ۸ - اسلوب کیا ہے ؟ ۹ - پریم چند کے ڈرامے -

''اُردو میں خاکہ نگاری'' اس مجموعے کا طویل ترین مضمون ہے (صفحہ ۱۷ تا ۸۲) - مصنف نے خاکے کو ایک طرح کا کارٹون (یا اسکیچ) قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں اُردو ادب کے سرمائے کا جائزہ لیتے ہوئے فرحت اللہ بیگ کے مضمون ''نذیر احمد کی کہانی'' کو اُردو میں سب سے اچھا خاکہ قرار دیا ہے - غالباً مصنف نے شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری دونوں کو مرادف قرار دیا ہے ، حالانکہ شخصیت نگاری یا شخصیہ نگاری ، خاکہ نگاری سے ذرا وسیع چیز ہے اور ان دونوں میں خاصا فرق بھی ہے - شخصیّہ نگاری کے لیے شخصیت (موضوع) اور شخصیت نگار کا گہرا رابطہ از بس ضروری ہے - چنانچہ اُردو میں جتنے کامیاب شخصیّے لکھے گئے ہیں ، وہ اسی بنیادی اصول کے مطابق ہیں - فرحت اللہ بیگ کے علاوہ رشید احمد صدیقی (گنج ہائے گراں مایہ) ، مولوی عبدالحق (چند ہم عصر) اور چراغ حسن حسرت (مردم دیدہ) اُردو کے نامور شخصیہ نگار ہیں اور ان کی کامیابی کا راز ذاتی تعلق اور مشاہدے پر مبنی ہے - مولانا محمد حسین آزاد کے خیالی مرقعوں کو ہم اس صنف (شخصیہ نگاری) میں شمار نہیں کر سکتے - البتہ انھیں خاکے یا اسکیچ کہہ سکتے ہیں جیسا کہ مضمون نگار کا خیال ہے - اس لحاظ سے اس مضمون میں اُردو کے اکثر شخصیوں اور خاکوں کا تذکرہ ہو گیا ہے - مناسب ہوتا اگر مضمون نگار حسرت کی ''مردم دیدہ'' (طبع ۱۹۳۹ء) کا ذکر موزوں جگہ پر ذرا تفصیل سے کرتے - یہ کتاب کم یاب ضرور ہے لیکن ناپید یا نایاب نہیں -

دوسرے مضامین میں مولوی مدن مختصر مضمون ہے لیکن معلومات افزا ہے - 'قائم چاند پوری' تحقیقی مضمون ہے لیکن تشنہ - قائم کا شاہ عالم کے عہد میں توپ خانے کا داروغہ ہونا (صفحہ ۹۵) تاریخی لحاظ سے غلط ہے - قائم نے اپنا تذکرہ ''مخزن نکات'' ۱۱۶۸ھ میں لکھا تھا اور اُس وقت شاہ عالم ثانی کے باپ شاہ عالمگیر ثانی کا عہد شروع ہوا تھا - ''آفتاب ہند'' بھی تحقیقی مضمون ہے اور اُنیسویں صدی کے نصف اول کی صحافت پر روشنی ڈالتا ہے - صفحہ ۱۱۶ کے حاشیے پر مضمون نگار نے 'جام جہاں نما' کے اجرا کے سلسلے میں عتیق صدیقی (ہندوستانی اخبار نویسی) کا حوالہ دیا ہے - اگر مضمون نگار اس کتاب کا دیباچہ بھی دیکھ لیتے تو اس اخبار کے اجرا (مارچ ۱۸۲۲ء) کے سلسلے میں عتیق صدیقی کا صحیح موقف واضح ہو جاتا - ''مرآۃ الشعرا'' پر

تنقید دلچسپ ہے ۔ مولوی یحییٰ تنہا (مرحوم) ایک وضع دار مصنف تھے ۔ وہ شاید اس برجا تنقید کے باوجود اپنی ہی بات کا پاس کرتے ۔ مجموعے کے بقیہ مضامین تنقید اور عملی تنقید کے اچھے نمونے ہیں جو قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں ۔ (ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار)

تحقیق و انتقاد | از ڈاکٹر اکبر حیدری ۔ ناشر ادبستان ، ۱۳۱ نرسنگ گڑھ سری نگر کشمیر ۔ قیمت ۶ روپے ، صفحات ۲۷۰ ۔

''تحقیق و انتقاد'' ڈاکٹر اکبر حیدری کے تنقیدی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے ۔ کتاب میں کل سات مقالے شامل ہیں ۔ مرثیہ ڈاکٹر حیدری کا پسندیدہ موضوعات میں سے ہے ۔ ''میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر'' ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے ۔ زیر نظر کتاب میں بھی مرثیے سے متعلق دو مقالے شامل ہیں : ''اردو رزمیہ شاعری'' اور ''میر انیس کے مرثیے۔۔رزمیہ ، المیہ'' ان دونوں مقالوں میں بھی تنقید کا وہی معیار قائم ہے جو انیس پر اُن کی مستقل تصنیف میں نظر آتا ہے ۔ اردو رزمیہ شاعری میں رزمیہ کی تعریف اور دنیا کی بڑی بڑی نظموں کا ذکر کیا ہے ۔ مضمون کا عنوان ''اردو رزمیہ شاعری'' ہے ، مگر اس میں صرف انیس کا ذکر کیا گیا ہے ۔ انیس کے بارے میں ان کا تنقیدی انداز کسی حد تک جذباتی ہے ۔ ملاحظہ ہو :

> ''میر انیس اردو کے پہلے اور آخری عظیم الشان رزمیہ شاعر ہیں ۔ ان کے کلام میں رزمیہ کی جملہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں ۔ انھوں نے اس صنف نظم کو وہ بلند درجہ دیا جہاں تک شاید ارسطو کا تصور بھی نہ پہنچ سکا تھا ۔''

اس مختصر سے تبصرے میں گنجائش نہیں کہ ارسطو اور انیس کے تصور المیہ پر بحث کی جائے ۔ صرف مضمون نگار کا زاویۂ نظر پیش کرنا تھا ۔

''تحقیق و انتقاد'' میں دو مقالے دو اہم کتابوں پر طویل تبصروں کی صورت میں ہیں ۔ ان مقالوں کے عنوان یہ ہیں : ''اردو انسائیکلوپیڈیا کا ناقدانہ جائزہ'' اور ''اردو لغات اور فرہنگ اثر (ایک جائزہ)''۔۔اول الذکر مقالہ فیروز سنز کی انسائیکلوپیڈیا (مطبوعہ ۱۹۶۲ع) پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے ۔ اس میں انسائیکلوپیڈیا کے مواد کو تحقیقی نظر سے پرکھ کر اس کی اغلاط کی نشان دہی کی ہے ۔ یہ مقالہ ڈاکٹر اکبر حیدری کی دقت نظر اور کلاسیکی ادب پر اُن کے وسیع اور گہرے مطالعے کا ثبوت ہے ۔ البتہ جدید ادب سے اُن کی واقفیت زیادہ معلوم

نہیں ہوتی ۔ دوسرے طویل تبصرے ''اردو لغات اور فرہنگ اثر'' میں اردو لغات کی تاریخ بیان کرنے کے بعد اُنیسویں اور بیسویں صدی میں تصنیف شدہ لغات سے فرہنگ اثر کا مقابلہ کیا ہے اور اس کی قدر و قیمت واضح کی ہے ۔ دو مقالے اس مجموعے میں ایسے ہیں جن میں میر ضمیر کی نادر مثنویوں ''مظہر العجائب''، ''نسخۂ محبت'' اور ''مثنوی معراج نامہ'' کا مفصل تعارف پیش کیا ہے ۔ میر ضمیر پر یہ دونوں مقالے اہم تحقیقی مواد فراہم کرتے ہیں ۔ ''تحقیق و انتقاد'' میں ایک مقالہ ''اردوادب میں طنز و مزاح'' پر بھی ہے ، جس میں ''اودھ پنچ'' اور سرشار کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے ۔ صفحہ ۲۱۳ پر ڈاکٹر اکبر حیدری ''فسانۂ آزاد'' کے متعلق لکھتے ہیں :

''سرشار نے اسے بڑی عجلت اور غیر ذمہ داری سے ترتیب دیا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ، وہ نشے کی حالت میں لکھا ۔ کتاب پر نظر ثانی نہیں کر سکے ۔''

یہ بات بالکل درست ہے کہ سرشار نے فسانۂ آزاد عجلت میں لکھا ہے ۔ سرشار کے محققین اس غلط فہمی میں بھی مبتلا ہیں کہ انہوں نے فسانۂ آزاد پر نظر ثانی نہیں کی ۔ ڈاکٹر اکبر حیدری بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہیں ۔ حال ہی میں محترم خلیل الرحمان داؤدی صاحب نے مجھے فسانۂ آزاد کا ایک نادر ایڈیشن عنایت فرمایا ہے ۔ یہ طبع دوم ہے ، ۱۸۸۶ء میں مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا ہے ۔ اس کے سرورق پر واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ مصنف کی نظر ثانی کے بعد شائع ہو رہا ہے :

''فسانۂ دلچسپ اودھ اخبار میں ابتدائے دسمبر ۱۸۷۸ء لغایت دسمبر ۱۸۷۹ء شائع ہوا تھا ۔ بعد نظر ثانی مصنف موصوف بار دوم حسب الایماے منشی نول کشور مالک مطبع اودھ اخبار مطبع منشی نامی نول کشور مقام لکھنؤ میں چھپا ۔''

میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر | مصنف ڈاکٹر اکبر حیدری ۔ ناشر ادبستان ، ۱۳۱ نرسنگ گڑھ ، سری نگر کشمیر ۔ قیمت ۱۵ روپے ۔ صفحات ۶۲۰ ۔

دورِ جدید میں اردو مرثیے پر جو چند معیاری کتابیں شائع ہوئی ہیں ، ''میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر'' ان میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے ۔ اردو مرثیے کے نقاد اب تک مرثیے میں ڈرامائی رنگ تلاش کرتے رہے ہیں مگر ڈاکٹر اکبر حیدری نے انیس کے مراثی کو رزمیہ شاعری قرار دے کر ادب میں ایک نئی جہت کی طرف قدم اٹھایا ہے ۔

اردو شاعری کے نقادوں کے نزدیک اب تک یہ مسئلہ طے نہیں ہو سکا کہ آیا مرثیہ ''ایپک'' کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں ؟ کیونکہ جہاں تک ایپک کے فن کا سوال ہے ، اس کی کچھ مشابہتیں مرثیے میں نظر آ جاتی ہیں اور انھی مشابہتوں کو بنیاد بنا کر مرثیے کو رزمیہ کا درجہ دے دیا جاتا ہے ۔ کلیم الدین احمد کا دعویٰ یہ ہے کہ مرثیہ ایپک شاعری میں شامل نہیں ہو سکتا ۔ ان کا خیال ہے کہ مغربی شاعری میں ایک صنف ہے جسے الیجی (Elegy) کہتے ہیں ، جس میں کسی کی موت پر آنسو بہائے جاتے ہیں ، اور ایک دوسری صنف ہے جسے ایپک کہتے ہیں اور جس میں مہتم بالشان رزم کی داستان ہوتی ہے ۔ اگر کوئی شاعر الیجی لکھتے لکھتے ایپک لکھنے لگے تو نتیجہ معلوم ۔ مرثیے میں کچھ ایسی ہی بات ہوئی ہے اور یہی سبب ہے کہ مرثیہ ایک مخلوط سی چیز ہو کر رہ گیا ہے ۔ کلیم الدین احمد کا تجزیہ بالکل درست ہے ، مرثیہ نگار بنیادی طور پر مرثیہ لکھنے بیٹھتا ہے ، رزمیہ نہیں ۔ اُس کا مقصد ایک مکمل رزمیہ داستان کی تشکیل نہیں ، بلکہ مرثیے کے ذریعے مصائب اہل بیت بیان کرنا ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ واقعات کربلا میں سے کوئی ایک واقعہ نظم کر دیتا ہے ۔ فنی طور پر ایپک کے لیے ضروری ہے کہ ایک عظیم الشان سلسلۂ واقعات موجود ہو اور یہ واقعات پیچیدہ نوعیت کے ہوں ۔ کلیم الدین احمد اردو مرثیے کے موضوع یعنی واقعۂ کربلا میں اتنی گنجائش اور وسعت نہیں پاتے کہ مکمل رزمیہ کا موضوع بن سکے ۔ ہمارے خیال میں واقعۂ کربلا مکمل رزمیہ کا موضوع بن سکتا تھا کیونکہ یہ قصہ کئی قصوں ، داستانوں اور معرکوں کی تفصیلات کا مجموعہ ہے ۔ شروع سے آخر تک واقعات محض سادہ نہیں ، ان میں پیچیدگی اور ڈرامائی رنگ موجود ہے ، مگر کسی شاعر نے مکمل رزمیہ کے طور پر اس واقعے کو نظم نہیں کیا ۔ الگ الگ ضمنی واقعات نظم کیے ہیں جو اپنے طور پر مکمل ہیں ، مگر ایپک کے لیے ضروری ہے کہ ایک مسلسل و مربوط نظم ہو ، جیسے ''شاہنامۂ فردوسی'' یا ''ایلڈ'' ۔ ان میں ایک مکمل و مربوط داستان ہے مگر انیس اور دوسرے مرثیہ گو شاعروں نے محض واقعات کربلا الگ الگ نظم کیے ہیں اور یہ ایپک کے اصول کے خلاف ہے ۔

مرثیے انیس کے ہوں یا کسی اور شاعر کے ، ان میں ایپک کی شان اور اہتمام نظر نہیں آتا ۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ ایپک لکھنے والا بالکل غیر جانبدار فرد ہوتا ہے ، مگر مرثیہ نگار واضح طور پر اہل بیت کا مداح ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اہل بیت کی مظلومیت اور صداقت مسلّم ہے ، اس سے انحراف ممکن نہیں ، لہٰذا مرثیہ نگار کی تمام تر ہمدردی اہل بیت سے ہوتی ہے ۔ مگر

ایک کی شان اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دونوں فریق برابر کی چوٹ کے ہوں اور ان کے درمیان غیر جانب داری سے عظیم تصادم دکھایا جائے - چونکہ واقعہ کربلا میں فریق مخالف کے کردار گھٹیا اور ذلیل ہیں اس لیے ایک کے مخصوص تصادم کی عظیم شکل نہیں بنتی -

یہ وہ چند مسائل ہیں جو اردو مرثیے میں رزمیہ کے تصور سے پیدا ہوتے ہیں - ڈاکٹر اکبر حیدری نے ''میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر'' میں کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے ؛ پہلا باب رزمیہ کی تعریف میں ہے - یہ تحقیقی مقالے (اس مقالے پر ۱۹۶۰ع میں لکھنؤ یونیورسٹی نے پی - ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی) کا بنیادی باب ہے - سارے مقالے کی بنیاد اسی باب کے مواد پر قائم ہے ، مگر مصنف نے اس اہم حصے کے لیے صرف سات صفحات وقف کیے ہیں - مقالے کے کل صفحات کی تعداد ۲۶۰ ہے - سات صفحات میں رزمیہ کی جو تعریف کی جا سکتی ہے ، وہ مصنف نے کر دی ہے - ایک مغربی صنف ہے - اس کے مطالعے کے لیے انگریزی میں بے شمار کتابیں موجود ہیں اور ان کے مطالعے کے بعد رزمیہ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا ، مگر مصنف نے اپنا مطالعہ صرف پانچ کتابوں تک محدود رکھا ہے

دوسرا باب دنیا کی عظیم ترین رزمیہ تصنیفات کے مختصر جائزے پر مشتمل ہے جس میں ایلیڈ ، اوڈیسی ، شاہنامہ فردوسی ، رامائن ، مہا بھارت وغیرہ کی داستانیں اور ان پر تنقید و تبصرہ شامل ہے - مصنف نے ان کتابوں کو بھی براہِ راست دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی - ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھتے وقت ضروری تھا کہ اصل مصادر کی موجودگی میں ثانوی مصادر کی طرف رجوع نہ کیا جاتا - مصنف نے اس باب کی تصنیف میں صرف اتنی زحمت گوارا کی ہے کہ ان کتابوں کے خلاصے اور تبصرے انگریزی کی مندرجہ ذیل دو مشہور کتابوں "The world great Books in out line" by J. A. Hammerton اور "Cassell's Encyclopaedia" سے اخذ کر لیے ہیں -

تیسرا باب ، انیس کی کردار نگاری کے فن پر ہے - یہ باب خاصی محنت سے لکھا گیا ہے - چوتھے باب میں انیس کے پلاٹس پر بحث کی ہے - پانچویں باب میں انیس اور دنیا کے رزمیہ شعرا کے فن کا مقابلہ دکھایا ہے - بعد کے ابواب کی ترتیب درست نہیں - چھٹا باب انیس کے پیشرو مرثیہ نگاروں کی شاعری کے جائزے پر مشتمل ہے - ساتویں باب میں انیس اور دبیر کی شاعری میں فرق دکھایا گیا ہے - آٹھویں باب میں اردو کی ممتاز مثنویوں کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ اردو مثنوی میں کوئی رزمیہ تصنیف کیوں وجود میں نہ آ سکی - نواں باب مرثیے اور

اس کے ارتقا اور میر انیس کے حالات کے بارے میں ہے ۔ چھٹے اور نویں باب کا موضوع ایک ہے ۔ دونوں میں انیس سے پہلے مرثیے کا ارتقا دکھایا ہے ۔ یہ ایک باب ہونا چاہیے تھا اور اس کا مقام بھی درست نہیں ؛ اسے رزمیہ کی تعریف اور دنیا کی عظیم رزمیہ نظموں کے بعد تیسرے باب میں آنا چاہیے تھا ۔ چوتھا باب حیات انیس پر مشتمل ہونا تو بہتر تھا ، حالات زندگی ابتدا میں ہوتے ہیں ۔ ''اردو مرثیے کا ارتقا'' میں مرثیے کا جائزہ بھی نا مکمل ہے ، خصوصاً شمالی ہند کے مرثیہ نگاروں پر توجہ نہیں دی گئی ہے ۔

ان چند کوتاہیوں کے باوجود مقالے کا وہ حصہ بہت معیاری ہے ، جہاں مصنف نے مراثی کی تشریح و توضیح کی ہے ۔ مرثیے کے مطالب اور باریکیوں کو وہ بہت خوب سمجھتے ہیں ۔ یہ حصہ یقیناً جاندار اور قابل قدر ہے ۔

کتاب لیتھو پر شائع ہوئی ہے ، کتابت اور طباعت درمیانہ درجے کی ہے ۔

تذکرۂ ریاض الفردوس | مصنف محمد حسین شاہجہان پوری ۔ مرتب مرتضیٰ حسین فاضل ۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۔

جوں جوں اُردو تحقیق آگے بڑھ رہی ہے ، پرانے تذکرے منظر عام پر آ رہے ہیں ۔ تذکرۂ ریاض الفردوس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ ریاض الفردوس تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلا حصہ عربی میں ، دوسرا فارسی اور تیسرا اردو میں ہے ، جناب مرتضیٰ حسین فاضل نے مذکورہ تذکرے کے حصہ اُردو کو الگ کتابی شکل میں شائع کیا ہے ۔ اس تذکرے میں ۲۳۹ کے قریب شاعر شامل ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے مصنف نے محض ذوق کی خاطر ''گلشن بے خار'' کا خلاصہ تیار کیا ہے ۔ وہ شعراً سے ذاتی واقفیت نہیں رکھتا ۔ لہٰذا ریاض الفردوس کے مواد کی سوانحی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں ہے ۔ مصنف محمد حسین شاہجہان پوری نے شاعر کا تخلص ، نام اور استاد کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے ۔ اس طرح شعرا کے حالات ایک سطر سے زیادہ نہیں بنتے ۔ اس کمی کو جناب فاضل کی توجہ نے پورا کیا ہے ۔ انھوں نے تذکرہ مرتب کرتے وقت شعراً کے سنین پیدائش اور وفات اور دیگر کوائف درج کر کے اس بے جان تذکرے کو نئی زندگی دے دی ہے ۔ فاضل مرتب نے دیباچے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تذکرہ ریاض الفردوس ، گلشن بے خار کا خلاصہ ہے اور اس کا ثبوت انھوں نے متن بناتے وقت دیا ہے ۔ متن میں جن شعرا کا ذکر ہے ، حواشی میں ''گلشن بے خار'' سے ان کا حوالہ دے دیا گیا ہے ۔

جناب فاضل کا یہ علمی کام قابل تحسین ہے کہ انھوں نے ایک گمنام تذکرے کو علمی حلقوں میں ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ متعارف کرایا ہے ۔ کتاب کی ترتیب کے بارے میں چند باتیں قابل ذکر ہیں ۔

۱ ۔ شاہ عالم آفتاب کا مولود ۱۶ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ لکھا ہے ۔ (ریاض الفردوس ۳۵)

۱۱۷۳ھ شاہ عالم کا مولود نہیں ، تخت نشینی کا سنہ ہے ۔

۲ ۔ کچھ شعرا کے محض سنہ دے دیے گئے ہیں ، یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ سنہ پیدائش یا وفات کا ہے ۔ مثلاً

اثر	:	(۱۱۱۲ھ/۱۸۰۶ع بعد)	صفحہ ۳۷
امیر	:	(۱۷۷۳ع)	صفحہ ۳۸
برق	:	(۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ع)	صفحہ ۵۶
سلیمان	:	(۱۲۵۳ھ/۱۸۳۸ع)	صفحہ ۹۵
وزیر	:	(۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ع)	صفحہ ۱۵۲
یک رنگ	:	قبل ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ع	صفحہ ۱۵۸

۳ ۔ پھر سنین وفات اور ولادت کے تعین کے سلسلے میں تحریری حوالہ دینا چاہیے تھا ۔

۴ ۔ رائے سرب سکھ دیوانہ کا نام رائے سرب سنگھ لکھا ہے ، صفحہ ۸۱ ۔

۵ ۔ مرتب نے اہتمام کیا ہے کہ شعرا کے سنین پیدائش و وفات درج کیے جائیں مگر یہ اہتمام ہر جگہ برقرار نہیں رہ سکا ۔ بیشتر شعرا کے سنین قطعی طور پر یا تخمیناً معلوم ہو چکے ہیں ، یہ درج ہونے چاہیئے تھے ۔ مثلاً ان شعرا کے سنین پیدائش معلوم ہو چکے ہیں ، مرتب نے محض وفات کا ذکر کیا ہے : آفتاب صفحہ ۳۵ ۔ مظفر علی خاں اسیر صفحہ ۴۴ ۔ نواب امیر خاں انجام صفحہ ۵۰ ۔ مصحفی صفحہ ۱۲۹ ۔ مظہر صفحہ ۱۳۱ ۔ میر صفحہ ۱۳۱ ۔ امام بخش ناسخ صفحہ ۱۴۲ ۔ دیا شنکر نسیم صفحہ ۱۴۵ ۔ شاہ نصیر صفحہ ۱۴۶ ۔ شاہ نیاز صفحہ ۱۴۸ ۔ نیر صفحہ ۱۴۹ وغیرہ ۔

۶ ۔ صفحہ ۱۰۶ پر لکھا ہے : صبا تخلص منو لال کایتھ لکھنوی ، شاگرد مصحفی کا ہے :

تلامذۂ مصحفی میں صبا تخلص کا ایک ہی شاگرد ہے جس کا نام کانجی مل صبا ہے ۔ (تذکرہ ہندی صفحہ ۱۴۱) ۔ ریاض الفردوس میں منو لال کائستھ صبا کا ذکر آیا ہے ۔ مصحفی کے اپنے تذکروں میں اس شاعر کا ذکر نہیں ملتا ، البتہ طبقات شعرائے ہند اور بہار بے خزاں (بحوالہ یادگار شعرا صفحہ ۱۴۶) میں

منو لال شاگرد مصحفی کا ذکر آیا ہے مگر اس کا تخلص صفا ہے ، تذکرہ نادر میں صفا کو شاگرد میر لکھا ہے - صفحہ ۹۸ -

تذکرہ سفید کاغذ پر کتابت و طباعت کے عمدہ اہتمام سے شائع ہوا ہے - ناشر احمد علی شیخ نے شیخ مبارک علی تاجر کتب کے پرانے ادارے سے عرصے کے بعد دوبارہ اشاعتی سرگرمیوں کا آغاز کیا ہے - توقع ہے وہ مستقبل میں بھی تحقیقی کتب ادب کے شائقین تک پہنچاتے رہیں گے -

(تبسم کاشمیری)

تنقید اور احتساب تصنیف : ڈاکٹر وزیر آغا - ضخامت : ۳۲۰ صفحات ، مجلد - طباعت اعلیٰ - رنگین و خوب صورت گرد پوش - قیمت ۵ روپے - ملنے کا پتہ : جدید ناشرین چوک اردو بازار ، لاہور -

وزیر آغا اردو کے چند سربرآوردہ نقادوں میں سے ہیں - ان کی تنقیدی آرا کو برصغیر پاک و ہند میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے - انھوں نے مسلسل مطالعہ اور انتھک محنت سے اپنے تخلیقی اور تنقیدی جوہر کو یوں صیقل کیا ہے کہ اب اس آئینے میں ہم نہ صرف اردو ادب بلکہ پورے برصغیر کے تہذیبی ارتقا کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں - وزیر آغا نے اتنا کچھ اور اتنے اہتمام سے لکھا ہے کہ ان کے تنقیدی نظریات اور طریق کار سے واقفیت حاصل کرنا قطعاً دشوار نہیں رہا - ان کے طریق کار سے واقفیت حاصل ہونے کے بعد اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ عقیدے اور تعصب میں جکڑے ہوئے ذہن سے بصیرت افروز تنقید کی توقع غلط ہے - وزیر آغا نے عقیدے اور تعصب کی مکمل نفی نہیں کی کہ یہ دونوں چیزیں شخصیت کا حصہ ہوتی ہیں لیکن یہ ضرور چاہا ہے کہ عقیدے یا تعصب تنقید (تحسین اور احتساب) کی بنیاد نہ بنایا جائے اور ادب پارے کو صرف کسی ایک مخصوص نقطہ نظر ہی سے نہ جانچا جائے بلکہ فن اور فنکار کا مطالعہ کشادہ ذہن کے ساتھ تمام نفسیاتی (شخصی) سماجی ، تواریخی ، تہذیبی (سیاسی ، مذہبی ، اخلاق وغیرہ) پس منظر میں کیا جائے - یعنی شاعر یا ادیب کے داخلی میلانات اور اس پورے ماحول کو پیدا کرنے والی روایتوں اور تہذیبوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے - بات یہ نہیں کہ اردو میں ان زاویوں سے ادب کو پرکھا نہیں گیا بلکہ یہ ہے کہ تخلیق اور خالق کا یوں احاطہ پہلے کبھی نہیں کیا گیا اور یوں ایک ساتھ اتنے زاویوں سے ان پر روشنی ڈالی گئی - وزیر آغا نے تمام مکاتیب فکر کو اپنے تنقیدی طریق کار میں یک جا کیا - یہی وہ نظریہ طریق کار نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ وزیر آغا نے اپنی راہ الگ

معین کی ہے یوں وہ اس دور کا سب سے زیادہ صاحب بصیرت نقاد قرار پاتا ہے۔
ترقی پسندوں پر وزیر آغا کی تنقید سے بعض اوقات یہ خیال ہوتا رہا کہ وزیر آغا خارج کو اہمیت نہیں دیتا یا کم دیتا ہے اور صرف انکشاف ذات کا قائل ہے لیکن وزیر آغا نے بہت جلد یہ غلط فہمی رفع کر دی اور بتایا کہ خارجی اور داخلی دنیاؤں کے تصادم میں سے ادب پیدا ہوتا ہے۔ محض ایک کا وجود بے معنی ہو گا۔ وزیر آغا نے ادب کا رشتہ نہ صرف خالق کی ذات بلکہ اس پورے ماحول سے وابستہ دیکھا ہے جس میں خالق سانس لیتا رہا ہے۔ یہی نہیں، اس نے اس ماحول کے عناصر ترکیبی کی تلاش میں ماضی کی طرف طویل سفر بھی کیے اور یوں پوری تاریخ انسانی کے پس منظر میں ادب کی پرکھ کا معیار قائم کیا۔

"تنقید اور احتساب" وزیر آغا کے متفرق مضامین کا مجموعہ ضرور ہے لیکن ان میں بھی ایک ربط قائم ہے۔ یہ ربط نقاد کی شخصیت نے پیدا کیا ہے۔ جس طرح ہم "اردو شاعری کا مزاج" سے نقاد کے نظریات کا علم حاصل کرتے ہیں اسی طرح اس کتاب سے بھی مستفید ہوتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ اس کتاب میں نظریات کو پیش کرنا مقصد نہیں بنا بلکہ ان نظریات کا عملی اطلاق ہوا ہے جن کا تفصیلی ذکر "اردو شاعری کا مزاج" میں ملتا ہے لیکن اطلاق کے ساتھ ساتھ جا بجا یہ نظریات بکھرے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔

کتاب کو بڑی آسانی سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
پہلا حصہ دو مضامین "وحدت سے اربعیت تک اور تخلیق اور تنقید" پر مشتمل ہے۔ ان میں وزیر آغا نے تخلیق اور تنقید کے بنیادی اور نفسیاتی عوامل کی نشاندہی کی ہے اور تخلیق کائنات سے تخلیق فن تک کے سفر کا بڑا بصیرت افروز تجزیہ کیا ہے اور تنقید کو بھی تخلیقی عمل قرار دیا ہے۔ وزیر آغا کے خیال میں تخلیق موجود مواد میں ربط تلاش کرکے شخصی رد عمل کے ذریعہ حیرت و استعجاب پیدا کرنے کا نام ہے۔ یہ شخصی رد عمل جسے ذوق نظر کہا جا سکتا ہے ایک فن کار کو دوسرے سے الگ کرتا ہے اور تنقید کا طریق کار بھی یہی ہے۔ وہاں بھی ذوق نظر اور تخیل کی وہی اہمیت ہے اس لیے تنقید کو محض ایک تاریخی جائزہ نہیں سمجھنا چاہیے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ تنقید اور تخلیق ایک ہی عمل کی مختلف صورتیں ہیں اور تنقید اگر تخلیق نہیں تو کچھ نہیں ـــــ بعد میں آنے والے مضامین ان نظریات کی پوری تائید کرتے ہیں۔

دوسرے حصے میں ۵ مضامین ہیں ۔ یہ حصہ غزل اور غزل گو شعرا پر ہے ۔ ولی ، آتش اور غالب کا مطالعہ ان اصولوں کی روشنی میں کیا گیا ہے جو پہلے سے وضع کر لیے گئے ہیں ۔ ''غزل کیا ہے ؟'' میں غزل کے مزاج کا تعین کیا گیا ہے ۔ غزل اور نظم کے فرق کی وضاحت کی گئی ہے ۔ غزل کی مستقل ہیئت اور اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ نظم کی اصل ہیئت آزاد نظم ہی ہے ۔ دوسرے مضمون میں غزل کے محبوب کے تصور پر بحث کرتے ہوئے وزیر آغا نے اس پر تمام زاویوں سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ نظم میں جو گوشت پوست کا محبوب نظر آتا ہے اس کی ایک منفرد شخصیت بھی ہے لیکن غزل کا محبوب باوجود چند تبدیلیوں کے آج بھی روایت ہی کی شکل رکھتا ہے ۔

ولی کے مطالعے میں وزیر آغا نے ان تمام نظریات کو پیش نظر رکھا ہے جن کا ذکر اس کتاب میں اور ''اردو شاعری کا مزاج'' میں ہوا ہے ۔ آسمان و زمین ، فضا اور دھرتی ، داخل اور خارج ، ماحول اور تہذیب سب کے حوالے سے بات کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ کیوں لامسہ ، سامعہ اور شامہ کے ساتھ ساتھ ولی کی باصرہ حس بھی قوی تھی ۔ پہلی تینوں حسیں جنگل (ہند کا معاشرتی ماحول) میں نیز ہوتی ہیں اور آخری کھلے میدان میں ۔ یوں ولی پر وارد ہونے والے مختلف تہذیبی اثرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔

آتش کا مطالعہ جس انداز سے ہوا ہے اس کی وضاحت کے لیے ایک اقتباس کافی ہے :

''آتش کی غزل میں دہلوی اور لکھنوی مزاج کی آویزش ہی نہیں انضمام بھی ہے ۔ خود آتش کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا تھا اس میں دہلی کی تہذیب اور فضا کے سارے اثرات موجود تھے لیکن اس کی شخصیت کی تعمیر میں لکھنو کی اس فضا کا بھی ہاتھ تھا جو ایک جدا تہذیبی ورثے کی امین تھی..... خود آتش کی شخصیت میں دہلی سے لکھنو کی طرف اس کے سفر کی نشاندہی ممکن ہے ۔ یہ سفر خارجی اور جسمانی سطح ہی سے متعلق نہیں ، اس کی نوعیت ایک بڑی حد تک نفسیاتی اور ذہنی بھی ہے......''

غالب کی شخصیت کو ایک کل کی شکل میں دیکھا گیا ہے اور اس مقبول نظریے سے سخت اختلاف کیا ہے کہ غالب تضاد کا شکار تھا ۔ وزیر آغا نے اس کی شخصیت کو مجروح اور منقسم تسلیم نہیں کیا ۔

تیسرا حصہ نظم کے بارے میں ہے ۔ جس میں ''نظم میں سمبلزم کی تحریک'' کے بعد ضیا جالندھری اور بل راج کومل کی شاعری کا محاکمہ کیا گیا ہے ۔ ان

مضامین کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وزیر آغا نے علامت کو بہت اہمیت دی ہے ۔ یوں تو علامت کا استعمال ہر شاعری ، ہر دور اور ہر ملک میں ہوتا ہے لیکن بقول وزیر آغا خاص حالات میں کچھ شعرا کے ہاں شدت کے ساتھ ہونے لگا اور تحریک کی شکل اختیار کر گیا ۔ ان شعرا کو علامت پسند کہا جانے لگا ۔ فاضل نقاد نے اس تحریک کے آغاز سے لے کر دور حاضر تک کے سفر کی داستان بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح اور کیوں اور کن مخصوص حالات میں یہ تحریک یورپ میں پروان چڑھی اور پھر برصغیر پاک و ہند کی ادبی اقدار پر کیسے اثر انگیز ہوئی ۔ وزیر آغا کے اس خیال سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اپنی انتہائی شکل میں علامت پسندی فن کی موت بن جاتی ہے ۔ اس نے بجا طور پر یہ فیصلہ دیا ہے کہ اعلیٰ فن اُس تحریک سے وابستہ ہے جو زمانوں کے آغاز سے اب تک جاری ہے اور جو زمان و مکان سے متاثر ہوتے ہوتے بھی ابدی کیفیت کا حامل ہے ۔

چوتھے حصے کا موضوع افسانہ ہے ۔ ''اردو افسانے کے تین دور'' اور ''اردو افسانے میں کردار کی پیش کش'' کے بعد شمس آغا کے افسانوں پر بحث کی گئی ہے ۔ ان مضامین میں پہلی بار افسانے کے بارے میں مکمل اور بھر پور انداز سے گفتگو کی گئی ہے ــــ وزیر آغا نے اردو افسانے کے تین دور متعین کیے ہیں ۔ پہلے دور میں داستان گوئی کے زیر اثر تخیل کی کارفرمائی زیادہ تھی اور افسانہ نگار کا ارضی مظاہر سے رابطہ زیادہ استوار نہ تھا ۔ افلاطونی نظریات مقبول تھے اس لیے کردار بھی مثالی نمونے ہی بنے رہے ، جیسا کہ سجاد حیدر یلدرم ، ل احمد ، نیاز اور ممنون کے ہاں نظر آتا ہے لیکن اس دور میں کچھ لوگ حقیقت پسندی بھی اختیار کیے ہوئے تھے جن کی نمائندگی پریم چندنے کی ۔ پریم چند کے ہاں آسمان اور زمین ، انکشاف ذات اور عرفان کائنات سب کچھ ہے اور اعلیٰ فن کے لیے یہ لازمی شرط ہے ۔ دوسرا دور ۱۹۳۵ع کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے جس میں کرشن چندر سرخیل کی حیثیت سے سامنے آتا ہے ۔ اس دور میں سماجی ، سیاسی اور نفسیاتی موضوعات افسانے میں داخل ہوئے لیکن زیادہ توجہ فرد کی بجائے اجتماع پر مرکوز رہی ۔ تیسرا دور تقسیم ملک کے بعد شروع ہوا اور جب جلد ہی ہنگامے فرو ہو گئے اور معاشرے میں قدرے سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہوا تو افسانہ نگاروں نے ہجوم یا اجتماع کی بجائے فرد کو اپنے افسانے کا موضوع بنا لیا ۔ چنانچہ کردار نگاری بھی اسی انداز سے متاثر ہوئی ۔ وزیر آغا نے مثالی نمونوں سے لے کر آزاد تلازمہ کے شکار کرداروں تک کے سفر کا حقیقت افروز مطالعہ کیا ہے ۔ افسانے کے بارے میں اس انداز سے پہلے کسی اردو نقاد نے بحث نہیں کی ۔

پانچواں حصہ نثر بالخصوص انشا کے بارے میں ہے - جس میں انشا نگاری کے علاوہ آزاد اور مولانا صلاح الدین احمد اور پطرس کے بارے میں بڑی بصیرت افروز باتیں کی گئی ہیں -

کتاب کا چھٹا اور آخری حصہ ادب کے عام موضوعات سے متعلق ہے - عنوانات یہ ہیں :

۱ - اردو ادب اور تازہ سماجی رجحانات - ۲ - ادب کی پرکھ - ۳ - ادب اور شعر - ۴ - عظیم ادب اور پر امن دور - ۵ - مجروح انا کا سفر - ۶ - کلچر کا مسئلہ - ۷ - ابلاغ سے علامت تک -

ان مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وزیر آغا نے کسی خاص پلان کے تحت اور کسی خاص نقطۂ نظر کی ترویج کے لیے فن کو استعمال کرنا پسند نہیں کیا - اس کا مطلب یہ نہیں کہ فن میں نظریہ سرے سے داخل ہی نہ ہو بلکہ یہ ہے کہ تخلیقی قوت پر کسی عقیدت یا تعصب کا پہرہ نہیں بٹھانا چاہیے ورنہ ادب کو ویسا ہی نقصان پہنچے گا جیسا ترقی پسند ادب کے ایک بڑے حصے کو پہنچا اور جس کی وجہ سے فیض ، ندیم ، عارف ، ساحر ، ظہیر ، سردار وغیرہ کے علاوہ بیشتر دوسرے ترقی پسند شعرا قابل ذکر ادب تخلیق نہ کر سکے اور خود ان شعرا کی تخلیقات کا ایک حصہ بھی آج معدوم ہوتا نظر آتا ہے - ادب و فن اور تخلیق و تنقید میں آسمانی اور ارضی تہذیبی (شخصی اور اجتماعی) تمام تقاضے برابر کی اہمیت رکھتے ہیں اور ادب کی پرکھ میں عقیدہ یا تعصب ہرگز کسوٹی نہیں بن سکتا۔"ادب اور خبر" میں کہا گیا ہے کہ ادب کو صحافت کی سطح پر لانا ادب کو موت کے منہ میں ڈالنا ہے - خبر میں جذبہ اور شخصی ردِ عمل نہیں ہوتا -

ادب پر امن دور میں زیادہ تخلیق ہوتا ہے یا ہنگامہ خیز دور میں ؟ اس سوال پر بحث کرتے ہوئے وزیر آغا نے کہا ہے کہ کوئی دور بھی مکمل طور سے پر امن نہیں ہو سکتا - ہاں بعض ادوار بعض دوسرے (یا آگے اور پیچھے کے ادوار) سے کم ہنگامہ خیز ہوتے ہیں - تخلیق فن اصل میں انہی کم ہنگامہ خیز ادوار میں ہوتی ہے اور انتہائی ہنگامہ خیز دور میں تخلیق فن کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور ہنگامی ادب پیدا ہونے لگتا ہے -

وزیر آغا کے ہاں کلچر یا تہذیب کا مسئلہ ادب و فن کے مسائل سے اسی طرح متعلق ہے جیسے انسان زندگی سے - اس لیے اس کا کلچر کے بارے میں بار بار گفتگو کرنا بھی سمجھ میں آتا ہے - وزیر آغا کو شکایت ہے کہ لوگ اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ پاکستانی کلچر کے اجزائے ترکیبی کیا ہونا چاہئیں ، یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اجزائے ترکیبی دراصل کیا ہیں - وزیر آغا نے کلچر کو درخت کی

علامت سے سمجھا ہے - درخت جو شاداب و سر سبز ہے اور زمین اور کھاد ایسی کثیف اشیا سے خوراک حاصل کرتا ہے ، لیکن ان کثیف اور بد بو دار عناصر کو خاص عمل سے گزار کر پھول ایسی نازک اور معطر شے میں ڈھال دیتا ہے - گویا زمینی اور آسانی عناصر کی یک جائی اور باہمی عمل اور ردِ عمل سے ظہور میں آنے والے معاشرے اور ماحول کے مکمل مطالعے ہی سے کلچر کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے اور اسے سمجھے بغیر اس کلچر کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والے فن کی تحسین ممکن ہی نہیں -

"اردو شاعری کا مزاج" کی طرح یہ کتاب بھی اردو کے تنقیدی سرمائے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے - وزیر آغا خود شاعر بھی ہیں اور اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں - یوں تخلیق اور تنقید کے بارے میں ان کی آرا زیادہ وقیع ہو جاتی ہیں - ہمارے ہاں شاعری پر وہ لوگ بھی تنقید کرتے ہیں جو شعر کا شعور نہیں رکھتے - وزیر آغا کی تنقید ایسے لوگوں کی ادبی موت کا اعلان بھی ہے - زیر تبصرہ کتاب کا مطالعہ اردو ادب کے قاری کے لیے لازمی ہے -

کتاب بہت صاف ستھری اور خوبصورت چھپی ہے (عرش صدیقی)

ادب اور جدید ذہن تصنیف : دیوندر اسر ، ضخامت : ۲۰۹ صفحات ، مجلد ، طباعت عمدہ ، رنگین سرورق - قیمت ۵۰/۳ روپے ہندوستانی - ناشر : مکتبہ شاہراہ : اُردو بازار ، دہلی -

"ادب اور جدید ذہن" اُردو کے معروف نقاد دیوندر اسر کی تازہ تصنیف ہے - دیوندر اسر اپنے مطالعے کی وسعت ، لہجے کی کاٹ اور اظہار کی صفائی کے لیے مشہور ہیں - زیر تبصرہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جدید ذہن کو ادب کے واسطے سے یا ادب کو جدید ذہن کے واسطے سے سمجھنے کی ایک کوشش ہے اور ہر طرح کامیاب کوشش ہے - بیسویں صدی فنی تحریکوں کی صدی ہے - اس صدی میں ہر دس سال کے بعد ایک نئی نسل ظہور میں آتی ہے - ارتقا کی رفتار بہت تیز ہو چکی ہے - تحریکیں چند ہی برس میں جوان اور بوڑھی ہو کر ختم ہو جاتی ہیں اور اپنے اثرات چھوڑ جاتی ہیں - لفظ "جدید" کے معنی ہر دور اپنے لیے خود متعین کرتا ہے - زیر تبصرہ کتاب کے مصنف کے پیش نظر بیسویں صدی کے ربع دوم و سوم ہیں اور اس نے تہذیب ، معاشرت اور ماحول کے خصوصی مطالعے سے اس دور کے ذہن اور ادب کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی ہے - یوں یہ کتاب جدید تہذیب کا مطالعہ بھی پیش کرتی ہے -

یہ تمام مضامین وسیع مطالعے کے بعد لکھے گئے ہیں اور قاری سے بھی

ایسے ہی سطالعے کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ یہ مطالعہ اگر صرف اُردو تک محدود رہے تو تحسین کا حق ادا نہ ہو سکے گا ۔ ان کو سمجھنے کے لیے جدید یورپ کی تہذیبی اور علمی و ادبی صورت حال سے واقفیت ضروری ہے کیونکہ بیشتر مضامین میں بات یورپ اور امریکہ کے حوالے سے ہی کی گئی ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آج کے عالمی اور انسانی بحران کی ذمہ داری تمام تحریکوں کا مرکز و منبع یورپ میں ہے ۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ مضامین برصغیر ہند و پاک کے بارے میں نہیں بلکہ یورپ کے بارے میں ہی لکھے گئے ہیں ، لیکن باوجود اس کمی کے کہ ہند و پاک کی تہذیبوں کے خصوصی حوالے سے بات بہت کم کی گئی ہے ، یہ مضامین ہمارے لیے بھی بے حد اہمیت رکھتے ہیں ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جدید یورپ کی تمام خرابیاں اور خوبیاں رفتہ رفتہ ہم تک پہنچ رہی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جدید یورپ کا کلچر ہی ایک طویل مدت کے لیے عالمی کلچر کا رتبہ اختیار کرنے والا ہے بلکہ کر چکا ہے ۔ یہ درست ہے کہ ابھی برصغیر ہند و پاک اس انتہا کو نہیں پہنچا ، جہاں یورپ اور امریکہ پہنچ چکے ہیں لیکن ہمارے تہذیبی سفر کا رخ اُسی منزل کی جانب ہے اور ہم انھیں مسائل سے دو چار ہیں جن سے یورپ گزر چکا ہے اور گزر رہا ہے ۔ ان حالات میں مصنف کا یہ رویہ پورا جواز رکھتا ہے ۔ یہ درست ہے کہ دادا ازم جیسی کم عمر تحریکیں ہمارے ہاں نہیں پہنچ سکیں اور یورپ میں بھی جلد ختم ہو گئیں ۔ لیکن بیشتر اہم تحریکوں سے ہمارا پڑھا لکھا طبقہ خاصا متاثر ہوا ہے ۔ یورپ کے واسطے سے بات کرنے کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ ہمارے بیشتر علوم و فنون اور تنقید کے منابع مغرب ہی میں ہیں ۔ اس کتاب میں صرف تین مضمونوں میں اُردو کی بات کی گئی ہے ، لیکن جس ذہن اور جس پس منظر کا مطالعہ مصنف نے کیا ہے ، وہ اُردو کے لیے اجنبی نہیں ۔ یہ درست ہے کہ عظیم جنگوں کا جو اثر یورپ پر پڑا وہ ہندوستان پاکستان پر نہیں پڑا ، اس لیے وجودیت کو جو اہمیت فرانس اور جرمنی میں حاصل ہوئی وہ ہمارے ہاں نہیں ہوئی ، لیکن آج جب کہ تہذیبوں کی جغرافیائی حدود ختم ہو رہی ہیں ۔ تحریکوں اور واقعات کے اثرات پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں ، ان اثرات کی شدت میں کمی زیادتی ہو سکتی ہے لیکن ان سے انکار ممکن نہیں ۔ پھر پوری دنیا تیسری اور خوفناک تر عالمی جنگ کے خوف اور فنا کے خوف کی اسیر ہے ۔ سائنسی ترق کے بعد یہ خوف محض ترقی یافتہ قوموں تک محدود نہیں رہ گیا ۔ سائنس کی ترق اور مشینوں کی غلامی نے فرد کی اہمیت کو کم کر دیا ہے ۔ سائنس اور نفسیات نے مل کر تہذیب اور اخلاق کی گرفت کو بے حد کمزور کر دیا ہے ۔ اقدار ختم ہو گئی ہیں ،

آدرش ٹوٹ گئے ہیں ، انسان تنہا ہے ، فرد آؤٹ سائڈر بن کر رہ گیا ہے ، گھر کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی ہے ۔ یورپ میں تو یہ سب کچھ انتہا کو پہنچ چکا ہے ۔ ہمارے ہاں بھی ملک اس تنزل کی راہ پر تیزی سے رواں ہے ۔ اقدار تو یہاں بھی سب ختم ہو گئی ہیں ، لیکن ابھی گھر کی حیثیت کسی حد تک قائم ہے ۔ جنسی زندگی بھی نئی تبدیلیوں سے تیزی سے متاثر ہو رہی ہے ۔ مانع حمل ذرائع ہمارے ہاں بھی شادی شدہ لوگ کم استعمال کرتے ہیں ۔ وہ فرد جو اداروں اور معاشروں پر قربان کر دیا گیا ہے خود کو غیر محفوظ پاتا ہے ۔ اس کے سہارے ٹوٹ گئے ہیں یا ٹوٹ رہے ہیں ۔ وہ جنسی بے راہ روی کے لیے جواز تلاش کر لیتا ہے ۔ اس کی داخلی اور شخصی زندگی کو معاشرہ اور ادارہ کوئی اہمیت نہیں دیتا ۔ فرائڈ اور ڈارون نے رہے سہے سہارے بھی چھین لیے ہیں اور آدمی کو حیوان اور ارتقا پذیر جسم سے زیادہ اوپر اٹھنے کی اجازت نہیں مل رہی ۔ مذہب ، روایت ، نصب العین ، اقدار کی اہمیت ختم ہو گئی ہے ۔ ریڈیو فلم ٹیلی ویژن کرکٹ سستا ہیجان انگیز ادب مقبول ہے ۔ اس صورت حال کا تجزیہ دیوندر اسر نے بڑے عالمانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں کیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ یہیں رک نہیں گیا بلکہ اس نے اس صورت حال کے خلاف پر زور احتجاج بھی کیا ہے اور ادیب سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ احتجاج کا حق ضرور استعمال کرے ۔

مصنف نے اس پس منظر میں اینگری ینگ مین ، آؤٹ سائڈر اور بیٹس کے ظہور کے اسباب تلاش کیے ہیں ۔ اس سلسلے میں چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

۱۔ ''اقدار کے شعبے میں تہذیب کا یہ بحران زیادہ نمایاں ہے ۔ مستقل اور دائمی اقدار بے معنی بن کر رہ گئی ہیں . . . . اور یہ بحران اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ادیب کسی سیاسی یا سماجی مقصد کے لیے جد و جہد کرنے کے بجائے جرائم پیشہ لوگوں ، زنا بالجبر ، امرد پرستی اور پر تشدد مجرمانہ حرکات کو ادب کا موضوع بنانے میں پیش پیش ہے ۔''

(بیمار تہذیب اور لاچار مسیحا)

۲۔ ''ہمہ گیر انسانی فطرت اور عمل کا نظریہ اب قابل قبول نہیں رہا ۔ اس لیے فرد اور گروہ کی منفرد حیثیت کا مطالعہ کرنے کی ضرورت کو ادب میں گہرے طور پر محسوس کیا جا رہا ہے ۔''

(بیمار تہذیب اور لاچار مسیحا)

کتاب میں جدید ادب اور اقدار کے کرائسس پر دو خاص مضمون شامل ہیں ، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پوری کتاب کا موضوع یہی ہے ۔ یورپ میں خدا اور انسان کی موت کو تہذیب کے دو بڑے سانحے قرار دیا گیا ہے اور خطرے کی بات

یہ ہے کہ مشرقی ممالک میں بھی یہ سانحہ رونما ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے - اقدار کا واسطہ اب کسی کام نہیں آتا اس لیے آج کا ادب مایوسی کا ادب ہے -

آج ادارے اور اجتماع کو فرد پر بہت زیادہ فوقیت حاصل ہے - چنانچہ مسئلہ فرد کو پہچاننے اور اس کی شخصی داخلی زندگی کو بچانے کا ہے - اقدار کے ٹوٹنے پر پتا چلا ہے کہ انسان نہ تو کائنات کا مرکز ہے ، نہ عظیم ہے ، نہ وہ خدا کا عکس ہے ، نہ شیطان کا پیغامبر - اس صورت حال نے انسان کی بے بسی میں اضافہ کیا ہے - بھیڑ میں فرد گم ہے - ہر فرد کا ایک نقلی چہرہ ہے ، یعنی اس نے نقاب اوڑھ رکھا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اصلی چہرہ کون سا ہے اور حقیقت کیا ہے - بقول مصنف :

"ہم جو کچھ روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں وہ وہ نہیں ، اس کا سطحی روپ ہے—چہرہ دل کا آئینہ نہیں - اندرونی حقیقت وہ نہیں ، جو بیان ہوتی ہماری نظر سطح پر ہے گہرائی پر نہیں - ہمارے چہروں پر نقاب ہیں اور ہماری نظر نقاب پر ہے ، چہرے پر نہیں - کیا ہم واقعی سرکس کے مسخرے ہیں ؟"

مصنف کا خیال ہے کہ اس صورت حال کو بیان کرنے کے لیے ایبسرڈ تھیٹر ہی فطری ذریعہ ہو سکتا تھا ، چنانچہ وہ کہتا ہے :

"انٹی تھیٹر انسان کی روح میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے - حقیقت طرح طرح کے روپ بھر کر سامنے آتی ہے - انٹی تھیٹر ان نقابوں ان رویوں اور ان بھیسوں کے پیچھے چھپے ہوئے اصل چہرے کو پیش کرنے کا نام ہے -"

واضح ہے کہ یہ سارا جھگڑا بنیادی اقدار کے متعین نہ ہونے کی وجہ سے ہے اور چونکہ منزل کے سراغ نہیں ملتے اور انتشار کی کیفیت ختم نہیں ہوتی اس لیے فرد جلا وطن اوٹ سائڈر کی زندگی کاٹنے پر مجبور ہے - ایسے کوئی نصب العین بھی نظر نہیں آتا جس کے لیے جد و جہد کی جائے - اصلاح اور انقلاب کے نعرے بے معنی ہوگئے ہیں - اس صورت حال میں صرف وجودیت کا فلسفہ ہی کسی حد تک امید افزا ہے -

وجودیت پر فاضل مصنف نے بڑا مکمل مضمون رقم کیا ہے جس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا - فطرت پرستی اور عینیت پرستی کے خلاف فلسفہ وجودیت ایک شدید رد عمل کے طور پر ابھرا - سارتر نے یہ کہہ کر کہ وجودی کے لیے ایمانداری ضروری شرط ہے، نوبل پرائز لینے سے انکار کیا اور کہا کہ ژاں پال سارتر اور ژاں پال سارتر نوبل انعام یافتہ میں بہت فرق ہے - یہ رویہ امید کی ایک

کرن تھا ، لیکن یہ کرن کرن ہی رہی ۔ بہر حال فاضل مصنف نے ادب پر تمام فلسفوں کے اثر کو تسلیم کرنے کے بعد کہا ہے کہ صرف وجودیت کا فلسفہ ہی ایسا فلسفہ تھا جو سارتر کے ہاں ادب کی شکل میں ظاہر ہوا ۔

فلسفہ وجودیت بھی حرف آخر نہ تھا ۔ کولن ولسن نے فرائیڈ کے ساتھ ساتھ وجودیت اور سارتر کو بھی ہدف تنقید بنایا اور یوں جدید دور کے بحران میں اور اضافہ ہوا ۔

مضمون ''دیو ہیکل ادارے اور بونے انسان'' میں فاضل مصنف نے فرد کی بے چارگی کا رونا رویا ہے کیونکہ اُسے اداروں ، حکومتوں اور معاشروں پر قربان کر دیا گیا ہے ۔ یہ مضمون کئی انگریزی تحریروں کی یاد دلاتا ہے اور ضمیر کی موت اور بے چہرہ انسان کی دریافت کی المناک خبر سناتا ہے ۔

دیوندر اسر نے جدید ذہن کو نہ صرف فلسفی تہذیب بلکہ نفسیات کے حوالے سے بھی پڑھا ہے اور فرائیڈ ، ژانگ ایڈلر وغیرہ کے اثرات کی نشان دہی بھی کی ہے ۔

فاضل مصنف نے ایک مضمون ''لذت پرست جسم اور تفریح پسند کلچر'' کے عنوان سے لکھا ہے اور اس امر پر افسوس کیا ہے کہ زندگی پر سستا پن مسلط ہے ۔ فن کی جمالیاتی اور روحانی اقدار کا احساس باقی نہیں رہا ۔ لذت پرستی ، جنسی تلذذ ، ہیجان ، مادیت پرستی ، تفریحی جرائم ، نشہ ، مفاد پرستی ، فلم ، کرکٹ ، ٹیلی ویژن ، ڈائجسٹ اور اشتہار کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے ۔ آج صلاحیت نہیں نمائش اہم ہے ، ذہانت نہیں دولت اہم ہے ۔ زندگی کے بارے میں بنیادی سوال کم پوچھے جا رہے ہیں ۔ شے نہیں ، شے کا تصور خریدا اور بیچا جاتا ہے ۔ کیونکہ لیبل اور اشتہار پر نظر مرکوز ہے ۔ یہ غیر یقینی صورت حال ہے اور دکھ یہ بھی ہے کہ پروٹسٹ کرنے والے بھی کم ہیں ۔ یہ مسئلہ ضمیر کا ہے ۔ ضمیر مر جائے تو کہاں کا پروٹسٹ ! کیسا احتجاج ! اس کے لیے توکسی سارتر کسی مولانا صلاح الدین احمد کی ضرورت ہے ، کسی ای ۔ ایم فارسٹر کی ضرورت ہے اور ایسے لوگ کم ہوا کرتے ہیں ۔ پھر بھی مصنف ادیبوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا احتجاج کا حق استعمال کریں ۔

کتاب میں جارج آرویل ، منٹو اور قرۃ العین حیدر پر الگ الگ مضمون بھی شامل ہیں جو اپنی جگہ خوب ہیں ۔

یہ کتاب باخبر انسان کی تخلیق ہے اور اپنے مواد اور اسلوب کے لحاظ سے بڑا مقام رکھتی ہے اور جدید ذہن کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری

ہے - یہ بے حد کارآمد کتاب اُردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے -
کتاب عمدہ کاغذ پر صاف ستھری چھپی ہے (عرش صدیقی)

آدھی رات کا سورج | تصنیف : اعجاز ناروق - مجلد - اعلیٰ آفسٹ طباعت دبیز کاغذ - خوبصورت سہ رنگا گردپوش - قیمت : ۷ روپے - ملنے کا پتہ : جدید ناشرین چوک اردو بازار ، لاہور -

اعجاز ناروق جدید نظم گو معروف شاعر ہیں - ''آدھی رات کا سورج'' ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے - کتاب کے نام ، گرد پوش کی تصویر اور کتاب کے سرسری مطالعے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اعجاز ناروق علامت پسند شاعر ہیں اور منفرد آواز رکھتے ہیں - علامت کا استعمال ہر دور اور ہر زبان کی شاعری میں ہوا ، لیکن مخصوص حالات کے زیر اثر بعض شعرا کے ہاں یہ استعمال دوسروں سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس میں شعور کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے - یہ علامت پسند شاعر کہلاتے ہیں - اعجاز فاروق بھی انہیں میں شامل ہیں - علامت کے استعمال میں شعوری طور پر احتیاط کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ بار بار استعمال ہونے کے بعد وہ بے اثر سی معلوم ہونے لگتی ہے اور مفاہیم و معانی کا ابلاغ ٹھیک طرح سے نہیں کر پاتی - اعجاز ناروق اس حقیقت سے واقف ہیں کہ علامت بجائے خود موضوع نہیں ، ایک وسیلہ ، ایک ذریعہ ہے ابلاغ کا - وہ بات جو صاف الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی ، علامت کے ذریعے اس کا مکمل ابلاغ ممکن ہے - چنانچہ انھوں نے کوشش کی ہے کہ نئی علامتیں تلاش کریں -

علامت پسندوں کا ایک گروہ ذات کے خول میں سمٹ کر اور معاشرے سے کٹ کر (جیسے یہ بھی ممکن ہو) ایسی شخصی علامتیں استعمال کرتا ہے ، جو مفاہیم کو واضح نہیں کر پاتیں - یہ گروہ ابلاغ کی ضرورت کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتا اور صرف اظہار اور تائید پر رک جاتا ہے ، لیکن بھول جاتا ہے کہ تائید اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک معانی کا ابلاغ نہ ہو - اعجاز فاروق اس گروہ سے بھی الگ ہے - اس کی علامت نئی نہ سہی ، وہ روایتی بھی نہیں ہیں ، بلکہ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان علامتوں کا استعمال اس انداز سے ہوا ہے کہ وہ نئے پن کا احساس پیدا کرتی ہیں - اعجاز ناروق محض عشق یا حسن کا شاعر نہیں - وہ ذات اور کائنات ، داخل اور خارج کے اسرار و رموز کا شاعر بھی ہے اور وسیع تر تخلیقی عمل اور تہذیبی ارتقا پر مسلسل نظر رکھتا ہے اور زندگی کے پر اسرار پہلوؤں کو دیکھ کر خود بھی حیرت زدہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی

اس تجربے سے گزارتا ہے ۔ اس کا شخصی ردِ عمل ہمیشہ علامتی رنگ میں ہوتا ہے اور یہ علامت تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ نفسیاتی پس منظر بھی رکھتی ہے ۔

زمین سے محبت انسان کی فطرت کا حصہ ہے لیکن بسا اوقات فرد کو اس محبت کا شعور نہیں ہوتا اور آسمان کی جانب اٹھنے کی خواہش کو زمینی رشتوں سے گریز سمجھ لیا جاتا ہے ، حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے ۔ آسمان اور زمین انسان کی روحانی اور مادی دنیاؤں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ آسمان کی طرف بڑھنے کی خواہش اصل میں زندگی کے سر چشمہ یعنی سورج سے تعلق کا اظہار ہے ۔ اس تعلق کو اعجاز فاروق نے پیڑ کی علامت سے ظاہر کیا ہے ۔ پیڑ کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں ، لیکن اس کا سر آسمان کی طرف اٹھا ہوا ہے اور بازو آفاق کی جانب پھیلے رہتے ہیں ۔ سمندر ، زمین اور آسمان کے درمیان رابطہ بنتا ہے ۔ بادل بن کر آسمان کی طرف جاتا ہے اور زمین پر برس کر اسے سیراب کرتا ہے اور پھر سمندر بن جاتا ہے ۔ اعجاز فاروق نے اس تعلق کو سائنسی ، حیاتیاتی اور علامتی شاعرانہ رنگ میں سمجھا اور استعمال کیا ہے ۔ یہ علامتیں اس کی تمام شاعری میں بکھری پڑی ہیں اور یہی اس کی شاعری کی بنیاد ہیں ۔ ان کو سمجھے بغیر اعجاز فاروق کی شاعری کی تحسین ممکن نہیں ۔

تخلیقی عمل کی طرح علامتوں کے انتخاب کا مسئلہ بھی پر اسرار ہے ۔ کبھی کوئی شے ذہن پر اس لیے مسلط ہو جاتی ہے کہ قریب ہے اور کبھی اس لیے کہ دور ہے ۔ بہر حال علامتوں کے انتخاب کے سلسلے میں فرد کی پرورش ، تعلیم اور ماحول کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ اعجاز فاروق کا سمندر سے گہرا تعلق ان دو برسوں کی زندگی کا ثمر ہو جو اس نے پاکستان بحریہ میں گزارے ۔ سمندر میں جانے کے بعد ہر جانب پانی ہی پانی ہوتا ہے اور پانی کا ذکر فاروق کے ہاں بہت ہے اور سر پر نیلا آسمان یا بادل یا سورج ہوتا ہے ۔ سورج کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ بادل بھی اسی کی عطا ہیں اور وہ زندگی اور روشنی کا سر چشمہ ہے ۔ اس کے بغیر نہ زندگی ہے ، نہ منزل ۔ پیڑ زمین کی یاد دلاتا ہے ۔ یوں ان تینوں علامتوں میں ایک پر معنی ربط نظر آنے لگتا ہے ۔ ان علامتوں کا استعمال بہت سی نظموں میں ہوا ہے ۔ چند عمدہ نظمیں یہ ہیں : ایک احساس ، تہذیب ، سفر ، میں اور تو ، عذاب ، مسافر کا کرب ، عرفان ، نیا جنم ، اپنا اپنا رنگ ، اجنبی شہر ، میں ، سمندر ، سروش وغیرہ ۔

نظموں سے چند اقتباسات جن میں علامتوں کا استعمال ہوا ہے ، درج ذیل ہیں :

۱- میرے پیڑ کو ابر کی ننھی ننھی پھواروں نے بالیدگی دی۔ سنہرے ضیاپاش

سورج کی کرنوں نے شاخوں کو چھو کر توانائی بخشی ۔

(تہذیب)

۲- میں اک سورج
جس سے دن کا اجالا ہو (میں اور تو)

۳- لاچاری کی آندھی چلے (لمحہ لمحہ میری موت)
تو میرا پیڑ اکھاڑے

۴- مرا شجر
روز آفرینش سے تا ابد قائم و سلامت (عرفات)

۵- میں اک شجر ہوں
جو آفرینش کے روز پیدا ہوا ، برہنہ (نیا جنم)

۶- میرا جسم
یہ نیلا گہرا پانی (میں)

۷- میرے دکھ کا ایک سمندر
گہرا ، جس کا انت نہیں (سمندر)

۸- میں سورج کے رتھ پر بیٹھ کے
حلقۂ شب سے نکلا چاہوں
چاند اور دھرتی دونوں مل کر
دائرے بنتے جائیں (دائرے)

جدید دور عام طور سے انتشار کا دور سمجھا گیا ہے اور آج کے انسان کو مایوس قرار دیا گیا ہے ۔ اعجاز فاروق کو اس صورت حال کا احساس ہے اور اس سلسلے میں سائنس نے جو کردار ادا کیا ہے وہ اس کے پیش نظر رہتا ہے ، لیکن شاعر نے اس صورت حال میں بھی حوصلہ اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔

پیڑ اب پیڑ تو نہیں ہے
غبار سا بن کے رہ گیا ہے یہ
آکسیجن کا ، ہائیڈروجن کا ، کاربن کا

. . . .

کہیں سے پھر کوئی بدلی آئے
کہیں سے سورج کی کرنیں پھوٹیں
جو کاربن کے غبار کو پھر شجر بنا دیں

اس کے بعد شاعر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بارش بن کر برسوں اور :

دھرتی میں مدغم ہو جاؤں

دھرتی جب مجھ کو اُگلے تو پودا بن کر پھوٹوں (لیا جنم)

اعجاز فاروقی کے ہاں انفرادیت کی جو چھاپ ہے اس میں ان کی نظم کی ہیئت کا بھی حصہ ہے۔ وہ ایک سچے شاعر کی طرح پہلے سے ہیئت یا نظم کے سائز کا فیصلہ نہیں کرتے۔ خیال خود بخود اپنا سانچہ منتخب کرتا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں نظم آزاد نے یہ ضرورت پوری کی ہے۔ شاعر نے مصرعوں کو توڑتے وقت اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ یہ کام خیال اور جذبے کے اظہار میں آنے والی فکری وقفوں پر چھوڑ دیا ہے۔

اعجاز فاروقی کے ہاں فکر کا غلبہ ہے لیکن جذبے کی آمیزش نے نظموں کو محض فلسفہ ہونے سے بچا کر عمدہ شاعری کے نمونے بنا دیا ہے۔ اُردو زبان ابھی پوری طرح اس انداز کی نظموں کی متحمل نہیں ہو سکی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کشادہ ذہن کے ساتھ ان نظموں کا مطالعہ کیا جائے۔ تعصب سے آزاد ہو کر ہی ان کے حسن سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔

کتاب آفسٹ پر بہت خوبصورت چھپی ہے اور صوری اور معنوی حسن کے امتزاج کا نمونہ ہے۔

(عرش صدیقی)

بلوغ الارب | (چار حصے) تالیف: محمود شکری آلوسی۔ ترجمہ: ڈاکٹر پیر محمد حسن۔ ضخامت: ۲۶۳۴ صفحات، سفید کاغذ، خوبصورت ٹائپ میں۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ قیمت: چالیس روپے (دس روپے فی جلد) تاریخ اشاعت: ۱۹۶۷ء، ۱۹۶۸ء۔ ناشر: مرکزی اُردو بورڈ گلبرگ لاہور۔

۱۸۸۹ء میں سویڈن میں سٹاک ہوم کے مقام پر مستشرقین کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں بغداد کے محمود شکری آلوسی کو بھی دعوت دی گئی۔ اس کانفرنس میں بہت سے علما نے شرکت کی اور عرب معاشرت پر اپنی اپنی تالیفات پیش کیں، لیکن کانفرنس میں آلوسی کی کتاب بلوغ الارب کو سب سے بہتر قرار دیا گیا۔ چنانچہ اس کو گولڈ میڈل کے ساتھ ساتھ انعام بھی ملا۔

"بلوغ الارب" صحیح معنوں میں انعام کی مستحق تھی۔ آلوسی نے اس کتاب میں قدیم عربوں کے متعلق وہ تمام معلومات جمع کر دی ہیں جو اب تک مختلف رسالوں اور کتابوں میں بکھری ہوئی صورت میں تھیں۔ اس طرح یہ کتاب قدیم عربوں کے متعلق ایک مختصر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ شائع ہوئی، لوگوں نے اسے بہت پسند کیا اور کئی حضرات نے تو اس کی نقل میں کئی کتابیں بھی لکھیں لیکن اب تک بلوغ الارب کی مقبولیت کو کوئی

نہیں پہنچ سکا ۔ اس کتاب کے متنوع اور رنگا رنگ مندرجات کی ایک جھلک دیکھیے :

عربوں کی تعریف اور انواع و اقسام ، عرب اور اعراب میں معنوی فرق ، جاہلیت کے معنی اور اس کا اطلاق ، عربوں کی فضیلت اور امتیازی اوصاف ، دوسری قوموں کے مقابلے میں عربوں کا نیز حافظہ ، عربوں کی قادر الکلامی ، عربوں کی سخاوت ، عربوں کا حلم ، عربوں کی دلیری ، عربوں کی شجاعت ، وہ لوگ جو عربوں میں سے وفاداری کے لیے مشہور ہوئے ، عربوں کی غیرت مندی ، عربوں کی شادیوں کے متعلق ، جاہلیت میں عربوں کے مسکن ، جزیرۃ العرب کی وجہ تسمیہ اور حصے ، عرب کے قدیم شہر ، یمن ، یمن کی معدلیات ، یمن کے محل اور مشہور عمارتیں ، تدمر ، مکہ ، کعبہ اور کعبہ کی فضیلت ، مکے کے اشراف ، جاہلیت میں عربوں کے میلے ، جاہلیت میں عربوں کے اجتماعات ۔

جاہلیت میں عربوں کا باہمی فخر و مباہات ، مفاخرت کے واقعات ، جاہلی عرب مصنف ، جاہلی عرب حکیم ، جاہلی عیدیں اور تہوار ، حدی خوانی ، موسیقی اور مناجات ، بسیار خوری کے واقعات ، مشہور کھانے ، مشہور دعوتیں ، کھانے کے برتن ، مشروبات اور عربوں کی عادات ، مشہور پانی ، پانی کے برتنوں کے نام ، اونٹوں کو پانی پلانے کے معاملے میں عربوں کی عادتیں ، پانی کی غذائیت کے بارے میں عرب حکما کے اختلافات ، بیاہ شادی کی رسومات ، عورت کی پسندیدہ خوبیوں کا ذکر ، عورت کی کمزوریوں اور برائیوں کا بیان ، طلاق اور عدت کے حالات ، شادی کے وہ طریقے جنھیں اسلامی شریعت نے باطل قرار دیا ، جاہلی جنگوں کا بیان ، عرب آلات حرب ، گھوڑے اور اس کے حسن و قبح کا ذکر ، گھوڑوں کی چال اور دوڑ کے بارے میں عربوں کی آراء ، عربوں کے مشہور گھوڑے ، مشہور شہسواروں کے حالات ۔

جاہلیت میں عربوں کی آگ کا بیان ، جاہلی شاہان عرب ، بادشاہوں کے القاب ، عربوں میں انعام دینے کا سلسلہ کس نے شروع کیا ، عربی درہم ، شاہی سلام اور لوازمات ، موحدین کا بیان ، بت پرستوں کا بیان ، عرب بت کیوں بناتے تھے ، بت پرستی کے دیگر اسباب ، سورج پرست ، چاند پرست ، دہریے ، صابی مذہب ، زندیق ، جنوں کی پرستش کرنے والے ، آگ کی پرستش کرنے والے ، ستاروں کی پرستش کرنے والے ، یہودی ، عیسائی ، جاہلی عبادات و اعمال ، بھوت اور چڑیل کے بارے میں شریعت کا نقطہ نظر ، جنوں کے بارے میں عربوں کی کہاوتیں اور حکایات ، لا پتہ ہونے والوں کے بارے میں عربوں کا مخصوص طرز عمل ، نوحہ اور واویلا کرنے کی رسم ، متبانی کے بال کاٹنے کی رسم ،

ژیان بندی کا طریقہ، سینے کو خون سے رنگنے کا بیان، خون بہا ادا کرنے کے طریقے، خلیع اور ملعون شخص کے بارے میں عربوں کا رد عمل، طاقتوروں کا چراگاہوں کو اپنے لیے مخصوص کر لینا، زندہ درگور کرنے کی رسم، قمار بازی، قرعہ اندازی، عربی مہینے اور ان کے ماخذ، جاہلی علوم و معارف، شعراے عرب کی شاعری کو ذریعۂ معاش بنانے سے نفرت۔

شعراے عرب کے کارنامے، مشہور خطبے، وصیتیں، چند جاہلی خطیب، اسلامی خطبے، علم الانساب، قبائل کے نام، پیتسمہ کی رسم، اُن لوگوں کا بیان جو نسب جاننے میں مشہور ہوئے، علم تاریخ، آسمان اور فضا کے بارے میں عربوں کا علم، انواء کی اقسام اور ایام، علم القیافہ، علم فراست، کہانت، عرافت، مشہور کاہن اور عارف، علم زجیر اور عیافہ، پرندوں سے فال لینے کی عادت، زجر اور فال میں مشہور لوگ، زجر اور فال کے منکر لوگ، علم طب، مشہور عرب اطبا، عربوں کی مشہور بیماریاں، علم الریافہ، صحراؤں میں راستہ معلوم کرنے کا علم، گھوڑوں کی بیماریاں دوائیں اور عیوب و محاسن، انسان کے جسم کے متعلق عربوں کا مبلغ علم، تیر اندازی کا علم، بارش اترنے کا علم، ہوائیں اور ان کے اوصاف، عربوں کو جہاز رانی کے بارے میں مبلغ معلومات، جاہلی ایام میں عربوں کی لکھائی، خط و کتابت اور اس کی رسوم، عربوں کی گنتی، عربوں کا ذریعۂ معاش، بادیہ نشینوں کے گھر کیسے ہوتے تھے، عربوں کا لباس، پگڑیاں اور اشعار میں ان کا ذکر، اشعار جو پاپوش کے متعلق ہیں، عربوں کی کھیتی باڑی، عربوں کا باہمی اتحاد، عدل کا بیان، بادیہ نشینوں کے وہ امور جن میں وہ شہریوں پر ممتاز تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مندرجات کی اس مختصر فہرست سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ "بلوغ الارب" کس پائے کی تالیف ہے۔ اسے پڑھ کر آنکھوں کے سامنے عربوں کی معاشرت کی پوری تصویر کھنچ جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی خود ان میں چل پھر رہا ہے۔ کتاب کا انداز بیان انتہائی دلچسپ ہے اور ایک بار کہیں سے بھی شروع کر دیں، ختم کیے بغیر اٹھنا مشکل نظر آتا ہے۔

اس عظیم کتاب کا مولف محمود شکری آلوسی بغداد کے محلے رصافہ میں ۱۹ رمضان ۱۲۷۳ھ (مطابق ۱۸۵۷ء) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم بغداد میں حاصل کی، تحصیل علم کے بعد درس شروع کیا، لیکن افراط و تفریط کا شکار ہو جانے کی وجہ سے اہل بدعت اس کے خلاف ہو گئے، والی بغداد عبدالوہاب پاشا نے سلطان عبدالحمید ثانی کے حکم سے اسے ۱۹۰۳ء میں شہر بدر کر دیا۔ بعد میں سرکردہ لوگوں نے سلطان سے سفارش کی اور اسے واپس بغداد آنے کی

اجازت مل گئی ۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور برطانیہ نے عراق پر حملہ کیا تو عثمانی حکومت نے آلوسی کو امیر عبدالعزیز آل سعود کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تا کہ اسے انگریزوں کے مقابلے میں ترکوں کی حمایت پر آمادہ کر سکے ۔ اس انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ آلوسی نے ایک کتاب تاریخ نجد لکھ کر آل سعود کی نظروں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا ۔ مگر اس مہم میں اسے ناکامی ہوئی کیونکہ انگریز پہلے ہی آل سعود کو ہموار کر چکے تھے ۔ واپس آ کر آلوسی گوشہ نشین ہو گیا ۔ عراق پر برطانوی عملداری میں اسے بغداد کا قاضی بنانے کی پیش کش ہوئی تھی ، مگر اس نے انکار کر دیا کیوں کہ انگریزوں کی ملازمت پسند نہ کرتا تھا ۔ عراق میں عرب حکومت قائم ہوئی تو وہ تعلیمی کمیٹی کا ممبر بنا ۔ بلوغ الارب کے علاوہ اس نے ۵۲ کتابیں اور رسالے تصنیف و تالیف کیے لیکن بلوغ الارب کو لازوال شہرت ملی ۔

اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب نے کیا ہے جو بہاولپور کی اسلامی یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر ہیں ۔ ترجمہ انتہائی سلیس شگفتہ اور رواں ہے ۔ کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم عربی سے ترجمہ شدہ تحریر پڑھ رہے ہیں ۔ اگر وہ صرف ترجمے پر اکتفا کرتے تو بھی یہ کام بہت عظیم تھا ، مگر انہوں نے ایک محقق کی طرح اس کتاب پر بہت محنت کی ہے اور بلوغ الارب کے اصل ماخذ کا پتہ چلا کر غلطیوں کی نشان دہی کی ہے اور ساتھ ہی ماخذ کا حوالہ بھی دیا ہے ۔ بعض مقامات پر جہاں ماخذ کا پتا نہ چل سکا تو قیاس سے کام لے کر اصل عبارت کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ چنانچہ ان کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ ''جب کبھی بلوغ الارب کا اصل عربی متن پھر سے شائع ہو اور مصحح اگر میرے حواشی سے مدد لے تو وہ کتاب کو کہیں بہتر اور اعلیٰ صورت میں پیش کر سکے گا ۔

یہاں ہم آلوسی کی ایک غلطی کی طرف خاص طور پر اشارہ کریں گے ۔ جیسا کہ فاضل مترجم اور مصحح نے لکھا ہے ، آلوسی نے بلوغ الارب کا مواد مختلف کتابوں سے لیا ہے لیکن کہیں بھی حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ظاہر یہ کیا ہے جیسے انھوں نے اصل ماخذوں سے ساری معلومات حاصل کی ہیں حالانکہ یہ درست نہیں ہے ۔ ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب مقدمے میں ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

''آلوسی نے اس کتاب کا بیشتر مواد عبدالقادر بغدادی کی تالیف ''خزانۃ الادب'' سے لیا ہے مگر ساری کتاب میں کسی ایک مقام پر بھی خزانۃ الادب کا نام واضح طور پر نہیں لیا ، پہلی اور معا کی صورت میں اس کتاب

کا نام لیا گیا ہے ، چنانچہ آلوسی اسے کہیں (۱ : ۳۲۷) کتاب لب لباب لسان العرب اور کہیں صرف لب اللباب کہتا ہے - بغدادی نے جہاں جہاں سے مواد لیا ہے ان کتابوں کا نام دے کر پورا مضمون نقل کر دیا ہے مگر آلوسی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بغدادی کی خزانۃ الادب کا ذکر ہی نہیں کرتا اور اصل کتابوں کا نام لے کر ، جن کا حوالہ بغدادی نے دیا ہے مضمون ، نقل کر دیتا ہے - جس سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ آلوسی نے اصل کتاب سے مواد لیا ہوگا - حالانکہ درحقیقت آلوسی نے اصل کتاب کی شکل تک نہیں دیکھی ہوتی - مزید براں آلوسی نے جو مضمون بھی مأخذ سے لیا ہے - اسے بغیر سوچے اور بغیر سمجھے من و عن نقل کر دیا ہے - اس سے آلوسی کا پول کھل جاتا ہے - مثال کے طور پر بلوغ الارب : ۲/ ۱۰۰ پر آلوسی لکھتا ہے :

السهانی طائر و هو موضع من الفرس لا احفظه

(سہانی ایک پرندہ ہے اور یہ گھوڑے کے جسم کا ایک مقام بھی ہے جو اس وقت مجھے یاد نہیں)

اس جملے کو پڑھنے والے کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ آلوسی یہ تشریح اپنی طرف سے پیش کر رہا ہے اور چونکہ اسے اس لفظ کی تشریح یاد نہیں رہی ، اس لیے اس کا اعتراف کرتے ہوئے ''لا احفظه'' کہہ رہا ہے ، حالانکہ یہ ساری تشریح العقدالفرید لابن عبدربہ (م ۳۲۸ھ-۹۴۰ع) سے لی گئی ہے جس کا ذکر آلوسی نے نہیں کیا ، چنانچہ ابن عبدربہ کہتا ہے :

و هو موضع من الفرس لا احفظه

ذرا غور فرمائیں کیا آلوسی نے ابن عبدربہ کے الفاظ کو بلا کم و کاست اپنی طرف منسوب نہیں کیا ؟ اور کیا اس نے دیانت داری سے اعتراف کیا ہے کہ وہ یہ تمام تشریح العقد الفرید سے لے رہا ہے ؟

ایک اور مثال دیکھیے ، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

''بلوغ الارب : ۱ : ۱۶۰ پر آلوسی لکھتا ہے :

قال ابو عبید البکری فی شرح امالی القالی

اور وہ یوں ظاہر کر رہا ہے کہ اس نے یہ عبارت خود ابوعبید البکری کی شرح امالی سے لی ہے حالانکہ غالباً آلوسی نے شرح امالی کی شکل بھی نہیں دیکھی - اس کتاب کو پہلی مرتبہ علامہ عبدالعزیز المیمنی نے ۱۹۳۶ع میں شائع کیا ، مگر آلوسی کا یہ راز بھی خود بخود فاش ہو جاتا ہے کیونکہ اسی صفحے پر آگے چل کر آلوسی لکھتا ہے :

"و اما کتاب المثالب و المناقب الذی بایدی الناس الیوم فانما هو للنضر بن شمیل الحمیری ۔"

ہم جب اس عبارت کا مقابلہ شرح امالی سے کرتے ہیں تو اس میں

و هو کتاب الواحدة المعلوم

کے الفاظ محذوف پاتے ہیں اور بعینہ یہی الفاظ بغدادی نے خزانۃ الادب میں چھوڑ دیے ہیں جس پر علامہ میمنی کو یہ نوٹ دینا پڑا......"

آگے اس نوٹ کی تفصیل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آلوسی نے یہ عبارت خزانۃ الادب سے لی تھی مگر لکھا یہ کہ براہ راست شرح امالی سے لے رہا ہے ۔

مولف کی ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بلوغ الارب ایک عظیم تالیف ہے اور عربوں کے بارے میں جتنے حالات و واقعات اس میں جمع کیے گئے ہیں ، کہیں اور نہیں مل سکتے ۔ محمود شکری آلوسی ایک بلند پایہ محقق ہو یا نہ ہو ، اعلیٰ پائے کا مرتب اور منظم ضرور تھا ۔

فاضل مترجم اور مصحح ڈاکٹر پیر محمد حسن یقیناً شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہ صرف اس کتاب کو اردو میں منتقل کیا ہے بلکہ اردو داں طبقے کے لیے عموماً اور عربی ادب کے طالب علموں کے لیے خصوصاً ، مولف کی غلطیوں کی طرف نشاندہی کی ۔ مرکزی ترقی بورڈ بھی تعریف کا مستحق ہے کہ اس عظیم ادبی دستاویز کو ، جس کا ہمارے ملی اور تاریخی سرمائے سے گہرا تعلق ہے ، اس خوبصورتی سے شائع کیا ۔

The Wounds Speak | انگریزی نظمیں از نعیم صدیقی ۔ ترجمہ : "القاضی"
ناشر : سیارہ پبلی کیشنز ، اچھرہ ، لاہور ۔ صفحات : ۶۴ ۔ قیمت ۱/۷۵ اور ۱/۲۵ ۔

زیر نظر مجموعہ نعیم صدیقی کی مندرجہ ذیل سات نظموں پر مشتمل ہے ۔ "لہو" ۔ "یروشلم ، یروشلم" ۔ "کشمیر تا یروشلم" ۔ "نفیر" ۔ "بحضور رسالت مآب" ۔ "بارود اور ایمان" اور "میں سوچتا ہوں" ۔ یہ سب نظمیں ان کے اردو مجموعۂ کلام "بارود اور ایمان" میں شامل ہیں ۔

جہاں تک انگریزی ترجمے کا تعلق ہے ، مترجم نے اگرچہ اردو اشعار کو لفظ بہ لفظ انگریزی سانچے میں ڈھالا ہے ، تاہم اس میں ترجمہ پن نہیں بلکہ رواں دواں ، شگفتہ انگریزی شاعری معلوم ہوتی ہے ۔ ان میں سے بعض نظمیں

اس سے پہلے انگریزی مجلے Pakistan Review میں شائع ہو چکی ہیں ۔

کتاب کا مقدمہ مریم جمیلہ بیگم نے لکھا ہے ۔ موضوع کی مناسبت سے شاعر نے کتاب کا انتساب عرب اور مسلمان بھائیوں کے نام کیا ہے ۔

(رفیع الدین ہاشمی)

نیا اُفق نئی منزلیں | مصنف : انور عنایت اللہ ۔ ضخامت : ۱۲۸ صفحات ۔ کاغذ سفید ، گرد پوش رنگین و دلکش ۔ قیمت تین روپے ۔ ناشر : پاک پبلشرز لمیٹڈ ، وکٹوریا روڈ ، کراچی ۔

اس کتاب کے مصنف انور عنایت اللہ صاحب اردو اور انگریزی کے جانے پہچانے مصنف ہیں ۔ وہ اگرچہ سائنس کے گریجوایٹ ہیں ، مگر اپنی جولانی طبع کے لیے انھوں نے ادبی میدان ، بالخصوص افسانوی ادب کو منتخب کیا ہے اور بڑی حد تک وہ اسی حیثیت سے شہرت بھی رکھتے ہیں ، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے موضوعات ان کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ موصوف کی دلچسپیاں بڑی متنوع ہیں ، جس کا ایک ثبوت زیر تبصرہ کتاب ہے ، جس میں مصنف نے سائنسی ترقی بالخصوص جوہری توانائی کی دریافت اور اس کے تدریجی ارتقا کی داستان بڑے دلکش انداز میں بیان کی ہے ۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے ۔ سائنس کی مشکل اصطلاحات سے حتی‌الامکان گریز کیا گیا ہے تاکہ طلبہ اور عام قارئین کسی دقت کے بغیر اس سے استفادہ کر سکیں ۔ کتاب معلومات افزا ہے اور اس کے مطالعے سے قلیل فرصت میں ایٹم (جو اپنے ہلاکت خیز بموں کی وجہ سے تباہی و بربادی کا مترادف خیال کیا جاتا رہا ہے) کے گوناگوں افادی پہلوؤں کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جوہری توانائی نے طبی ، صنعتی اور زرعی شعبوں میں انسانی فلاح و بہبود کے لیے کتنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور کس طرح اس کی ہلاکت خیزی انسانی سود و بہبود کا مظہر بن گئی ہے ۔

یہ کتاب اس لائق ہے کہ ابتدائی درجات کے سائنسی نصاب میں شامل کی جائے ۔ اس کتاب پر مصنف کو دو ہزار روپے کا انعام بھی یونیسکو کی طرف سے ملا ہے ۔

اس کتاب میں بعض الفاظ کا استعمال محل نظر ہے ۔ مثلاً :

صفحہ ۱۵ پر ''کار آمد کام'' کی ترکیب عجیب معلوم ہوتی ہے ۔ کار آمد کے معنی ہی ''کام آنے والا'' یا ''کام کا'' ہیں ۔ اس کی بجائے ''مفید کام'' بہتر ہوتا ۔

صفحہ ۱۲ پر ایک ٹکڑا ہے ''گرد و پیش کے ماحول کا'' گرد و پیش اور ماحول ایک ہی بات ہے ، اس لیے ان میں سے کسی ایک کو رکھنا چاہیے ۔

صفحہ ۱۸ پر یہ فقرہ ہے ''صبح کاذب کے آثار ہوئے'' آثار ہونا روزمرہ کے خلاف ہے ۔ اس کی بجائے آثار ظاہر ہونے ہونا چاہیے ۔

ایک جگہ ''برسہا برس'' ہے جو غلط ہے ۔ برس ہندی لفظ ہے ، جس کی جمع فارسی قاعدے سے ''ہا'' کے اضافے سے نہیں بنائی جا سکتی ۔ اس کی جگہ ''سالہا سال'' ہونا چاہیے تھا ۔

Tracer کا ترجمہ ''نشان گر'' کیا گیا ہے ، جو غیر موزوں ہے ۔ نشان دہ یا سراغرساں زیادہ بہتر ترجمہ ہوتا ۔

بہرحال چند ایسی اغلاط کے باوجود یہ تصنیف اردو کے ذخیرے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے ۔ ضخامت کے لحاظ سے قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن اس دور میں ارزاں کون سی چیز ہے جو کتابوں کی گرانی کی شکایت کی جائے ۔

بیماریوں کے خلاف جہاد | مصنف : بدر منیر ۔ ضخامت : ۱۳۴ صفحات ۔ کتابت و طباعت عمدہ ، کاغذ سفید ، رنگین گرد پوش ۔ قیمت : تین روپے ۔ ناشر : پاک پبلشرز لمیٹڈ ، صدر ، کراچی ۔

اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ، طبی سائنس کے ارتقاء کا حال بیان کیا گیا ہے ۔ تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ بعض خطرناک اور مہلک امراض کے اسباب اور علاج کی دریافت میں محققین نے کس قدر دماغ سوزی اور جاں نشانی سے کام لیا ہے ۔ یہ انھیں لوگوں کی جگر کاوی و جاں بازی کا ثمرہ ہے کہ آج ان میں سے بیشتر امراض پر قابو پا کر انسان کو ان کی غارت گری اور ہلاکت آفرینی سے بڑی حد تک محفوظ کر دیا گیا ہے ، ورنہ اس سے پہلے ان کی تباہ ناکی کے آگے انسان بےبس تھا اور ان کو عذاب خداوندی اور دیوتاؤں کے قہر و غضب کا ثمرہ خیال کرتا تھا ۔

یہ کتاب طبی تحقیق و ترقی کی سبق آموز اور ولولہ خیز داستان ہے ۔ انداز بیان سادہ اور دلچسپ ہے ۔ بچوں کے علاوہ ایک عام قاری کے لیے بھی اس کا مطالعہ دلچسپ اور معلومات افزا ثابت ہوگا ۔

بعض ضمنی واقعات کے بیان اور الفاظ کے استعمال میں مصنف نے احتیاط سے کام نہیں لیا ۔ امید ہے کہ آئندہ ، مصنف ایسی غلطیوں کا اعادہ نہ کریں گے ۔ لفظ ''کیمیا گر'' متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے ، جو غالباً Chemist

کا ترجمہ ہے ۔ یہ درست ہے کہ Chemistry کا ترجمہ اردو میں "کیمیا" کیا جاتا ہے ، لیکن "کیمیا گر" اردو میں مہوس یا اکسیر سے سونا بنانے والے کو کہتے ہیں اور سونا بنانے کے اس فن کو کیمیا گری کہا جاتا ہے ۔ انگریزی میں اس کے لیے ایک دوسری اصطلاح Alchemy رائج ہے ۔ اس لیے یہاں "کیمیا گر" کی بجائے کیمیادان یا ماہر کیمیا ہونا چاہیے ۔

صفحہ ۱۰۴ پر مصنف نے ضمناً بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب لشکر اسلام میں طاعون کی وبا پھوٹی تو حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ کوئی شخص طاعون زدہ علاقے سے بھاگنے کی کوشش نہ کرے ۔ چنانچہ لشکریوں نے اس حکم کی حرف بحرف تعمیل کی اور ہزاروں سپاہی اس کا شکار ہوگئے ۔ مصنف کا یہ بیان خلاف واقعہ ہے ۔ مولانا شبلی کی تحقیقی تالیف "الفاروق" کا بیان ہے کہ یہ وبا جو تاریخ میں عمواس کی وبا کے نام سے مشہور ہے ۱۸ھ میں اسلامی لشکر میں پھیلی ۔ حضرت عمرؓ کو جب اس کی خبر پہنچی تو وہ خود موقع پر پہنچے اور لشکر کو کوچ کا حکم دیا ۔ سپہ سالار فوج حضرت ابو عبیدہؓ اسے تقدیر الٰہی سمجھتے تھے اس لیے غصہ میں حضرت عمرؓ سے کہنے لگے "أ فراراً من قدر اللہ" یعنی کیا تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو؟ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے کہا "نعم افر من قضاءاللہ الی قضاءاللہ" یعنی ہاں ، میں تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف ہی بھاگتا ہوں ۔

اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مصنف کے بیان کے خلاف حکم دیا تھا اور وہ وبا کی روک تھام کی مناسب تدابیر کو بھی منشائے تقدیر کے عین مطابق خیال کرتے تھے ۔

اس کتاب پر مصنف کو یونیسکو کی جانب سے دو ہزار روپے کا انعام ملا ہے ۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک کامیاب تصنیف ہے ۔

روشن کا کارنامہ | مصنف : نا معلوم ۔ ضخامت : ۹۶ صفحات ۔ کاغذ سفید ، کتابت و طباعت : گوارا ۔ قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے ناشر : مکتبہ دانیال ۔ کراچی ۔

جاسوسی ادب ہماری نئی پود میں جتنا مقبول ہے ، سنجیدہ حلقوں میں اتنا ہی بدنام اور مطعون ہے ۔ اور یہ بھی حقیقت کہ سطحی قسم کے جنسی اور جاسوسی ناولوں نے ہمارے معاشرے میں خوب زہر پھیلایا ہے ۔ ہماری نژاد نو کی بے راہ روی میں اس قسم کی کتابوں کا بڑا نمایاں حصہ ہے ۔ ان سے نا پختہ ذہنوں میں جرائم کا شوق پیدا ہوتا ہے ۔ کیونکہ ایسی کتابوں میں جرائم کو کارنامہ اور مجرموں کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ارتکاب جرم کے نت نئے طریقے بتائے جاتے ہیں ۔ لیکن فی نفسہ جاسوسی ادب کوئی بری چیز نہیں ۔

اگر اصلاح کا مقصد پیش نظر ہو تو اس سے تفتیش جرائم کا کام لیا جا سکتا ہے اور جرائم کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے ۔ اس میں ایک لڑکے روشن کی کہانی بیان کی گئی ہے ، جو اپنی ہمت اور ذہانت سے کام لے کر ایک اغوا شدہ لڑکے رحیم کو غنڈوں کے چنگل سے نجات دلانے اور مجرموں کو قانون کے حوالے کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔ کہانی دلچسپ ہے اور اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہے ۔ زبان سیدھی سادی اور آسان ہے ۔ کہانی اگرچہ سپاٹ اور فنی پختگی سے عاری ہے لیکن چونکہ عام روش سے ہٹ کر اصلاحی مقصد کے پیش نظر لکھی گئی ہے اس لیے حوصلہ افزائی کی مستحق ہے ۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ناشر آئندہ اس موضوع پر اچھے مصنفین کی معیاری کتابیں شائع کر کے فنی اور اصلاحی تقاضوں کو بیک وقت پورا کرنے کی کوشش کریں گے ۔

کتاب کے مصنف کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ۔ مصنف کے نام کو پوشیدہ رکھنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ۔

بچوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر دلچسپی اور افادیت کا باعث ہو سکتا ہے ۔

(وارث سرہندی)

ابتدائی اُردو | کتاب ''ابتدائی اردو'' ڈاکٹر عبدالرحمان بارکر صاحب کی ضخیم تالیف ہے جو انھوں نے اپنے وطن کے انگریزی دان طبقے کی اردو شناسی کے لیے مرتب کی ہے ۔ کتاب کی تدوین کے سلسلے میں وہ تین سال (۱۹۵۹ تا ۱۹۶۲ء) پاکستان میں مقیم رہے اور یہیں اپنے منصوبے کے جملہ وسائل مہیا کیے ۔ اسی سلسلے میں وہ اورینٹل کالج سے بھی وابستہ رہے ۔

مؤلف کو ، جیسا کہ ظاہر ہے ، تدریس اردو میں دو بڑی مشکلات کا سامنا تھا ؛ پہلی مشکل یہ تھی کہ انگریزی دان طلبہ کے لیے اردو حروف تہجی اجنبی ہیں اور پھر حروف کو ملا کر لفظ بنانا اور دائیں سے بائیں پڑھنا اور لکھنا اس پر مستزاد ۔ دوسری مشکل یہ کہ جن لوگوں کو وہ اردو پڑھانا چاہتے ہیں وہ ابجد کے طالب علم نہیں بلکہ ایسے طالب علم ہیں جن کی دماغی قوتیں نشو و نما پا چکی ہیں اور روز مرہ کے مسائل کے متعلق وہ اپنے خیالات کا بخوبی اظہار کر لیتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ پختہ فکر طلبہ کو نئی زبان کے حروف ابجد سیکھنے میں چنداں دلچسپی نہیں ۔ وہ خود بالغ ہیں یا بالغ حضرات کی طرح زندگی سے متعلق مربوط عبارت اور مسلسل مضمون ہی کو پسند کرتے ہیں ۔ مؤلف نے ان

مشکلات کا حل بڑے جامع اور فعال طریق سے پیش کیا ہے - انہوں نے شروع میں نہ طلبہ کو حروف ابجد سکھائے ہیں نہ حروف کو ملا کر الفاظ بنانے کا اہتمام کیا ہے - بلکہ طلبہ کی فکری سطح کے پیش نظر عام مسائل زندگی بصورت سوال و جواب آسان فقروں میں پیش کیے ہیں - لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوال و جواب کو وہ پڑھیں کیونکر اور سمجھیں کیسے ؟ اس کے لیے مؤلف نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو کے سوال و جواب کا مفہوم انگریزی میں لکھا ہے - ساتھ ہی اردو فقرات سے آشنا کرانے کے لیے ان سوال و جواب کو رومن رسم الخط میں پیش کیا ہے - گویا اردو پڑھنے اور سمجھنے کی مشکلات کو حل کرنے کا یہ پہلا قدم ہے - جوں جوں طلبہ تدریس کے میدان میں آگے بڑھتے ہیں ، بول چال کا یہ سلسلہ زندگی ، خصوصاً پاکستانی زندگی کا احاطہ کیے چلی جاتی ہے - ان میں سیکھے ہوئے الفاظ کا بھی برابر اعادہ ہوتا ہے - گویا الفاظ کے جو نقوش طلبہ کے دماغوں میں ابھرے ہیں ، وہ پختہ تر ہوتے جاتے ہیں -

بارکر صاحب جب طلبہ کو بول چال کے لیے تیار کر لیتے ہیں اور اردو شناسی کا ذوق پیدا کر دیتے ہیں تو انہیں اردو کے حروف ابجد سکھاتے ہیں اور الفاظ کے اجزا کی طرف توجہ دلاتے ہیں - گویا مشکل عمل کی طرف سے آسان عمل کی طرف آتے ہیں - جوں جوں بول چال کی سطح بلند ہوتی ہے ، حروف اور ہجا کی شناخت بھی بڑھتی جاتی ہے -

سوال و جواب کے ساتھ ساتھ مؤلف مربوط عبارات کی طرف بھی آتے ہیں - سوال و جواب اور مربوط عبارات کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اجنبی زبان سیکھنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور عام کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد دیتے ہیں -

نصابی الفاظ کی رفتار استعمال پر ان کی خاص نظر ہے - مثال کے طور پر جو الفاظ ۸۰ فی صد سے ۵۰ فی صد تک لکھنے اور بولنے میں آتے ہیں ، ان سے طلبہ کو پہلے آشنا کیا گیا ہے اور جو الفاظ ۵۰ فی صد سے کم استعمال ہوتے ہیں، انہیں آئندہ اسباق کے لیے اٹھا رکھا ہے - اس طرح جوں جوں الفاظ کی رفتار استعمال کم ہوتی ہے ، وہ ایسے الفاظ اور آگے لے گئے ہیں - اس طرح درسی استطاعت بڑھنے کے ساتھ ساتھ کم استعمال ہونے والے الفاظ بھی طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں شامل ہوتے جاتے ہیں -

یہاں ''ابتدائی اردو'' کی بعض جزئیات پر نظر ڈالنا بھی مناسب ہوگا -

یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے - پہلی جلد میں ۱۵ اسباق ہیں ، جنھیں

مؤلف نے ''یونٹ'' کا نام دیا ہے ۔ عام بول چال ، مطالعہ الفاظ ، رسم الخط ، تجزیہ ، ضمنی ذخیرہ الفاظ اور صرف و نحو کی مشقیں ہر یونٹ کا لازمہ ہیں ۔ پہلے پانچ یونٹوں میں مؤلف نے تدریس اردو کے لیے رومن رسم الخط کا سہارا لیا ہے ۔ چھٹے یونٹ میں اردو رسم الخط کا آغاز کیا ہے اور مختلف مقامات پر حروف کی شکلیں واضح کی ہیں ؛ مثلاً حرف ''ن'' لفظ کے شروع میں آئے تو اس کی کیا صورت ہوتی ہے ، درمیان میں آئے تو کیا اور آخر میں آئے تو کیا ۔ ساتویں یونٹ میں سابقہ طریق کار کے ساتھ ساتھ لفظوں کے ہجے بتائے ہیں ؛ مثلاً پ ل ، پ ل ، پل وغیرہ ۔ اس یونٹ میں بول چال کے ساتھ ساتھ اردو کے مربوط فقرات اور عبارات بھی ہیں ۔ یہ سلسلہ باقی کے تمام یونٹوں میں بھی قائم رکھا گیا ہے ۔ دس یونٹ سے پندرہ یونٹ تک بول چال کی مشقیں ، فقرات اور عبارات سب اردو رسم الخط میں ہیں جن میں روزمرہ کے واقعات کی تفصیل بتائی گئی ہے ۔

دوسری جلد میں پہلی جلد کی طرح سوال و جواب ، مطالعۂ الفاظ ، رسم الخط اور تجزیہ سبھی کچھ شامل ہے ۔ اس کے علاوہ بعض اہم مضامین تاریخ پاکستان و ہند ، تاریخ پاکستان ، اردو ادب کی مختصر تاریخ وغیرہ بھی درج کیے گئے ہیں ۔ اسباق کے آخر میں طلبہ کی تحصیلات کا امتحان کرنے کے لیے مشقیں بھی لکھی گئی ہیں ۔ تیسری جلد میں اردو کے بنیادی الفاظ مع انگریزی مرادفات شامل کیے گئے ہیں ۔

ان خصوصیات تدریس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی دان حضرات کو ایک نئی زبان سکھانے کا یہ طریق نہایت کامیاب اور مؤثر ہے ۔ امید کی جا سکتی ہے کہ اس طریقے سے انگریزی دان طلبہ دو سال کے عرصے میں اچھی خاصی اردو لکھنے اور بولنے پر قادر ہو سکتے ہیں ۔

ابتدائی اردو کی پہلی جلد ۴۹۷ صفحات ، دوسری جلد ۵۶۸ صفحات اور تیسری جلد ۲۲۱ صفحات پر مشتمل ہے ۔ رسم الخط نستعلیق ہے اور چھپائی بلاکوں کے ذریعے کی گئی ہے ۔ تینوں جلدیں خوبصورت تصاویر اور نقشوں سے مزین ہیں ۔

اس ضخیم تدریسی کتاب کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر محمد عبدالرحمان بارکر ، حسن جہانگیر ہمدانی ، خواجہ محمد شفیع اور شفیق الرحمان صاحب کاظمی کا بھی تعاون حاصل رہا ہے ۔ اسے انسٹیٹوٹ آف اسلامک سٹڈیز میکگل یونیورسٹی مانٹریال کینیڈا نے ۱۹۶۷ع میں طبع کرایا ہے ۔

(مقبول بیگ بدخشانی)

اُردو—اخباری زبان ڈاکٹر عبدالرحمن بارکر کی دوسری کتاب ''اخباری زبان'' تدریس اُردو کے سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ اس کے ذریعے اُنھوں نے چاہا ہےکہ اُردو سیکھنے والے انگریزی دانوں کی تدریسی استطاعت بڑھائیں اور اُنھیں پاکستان کے حالات سے بالخصوص اور عالمی حالات سے بالعموم روشناس کرائیں ۔

فاضل مولف نے پاکستان کے قیام کے دوران ملک کے تمام مقتدر روز ناموں کا گہری نظر سے مطالعہ کرکے اپنی کتاب کے لیے اہم مواد فراہم کیا اور تدریسی ضرورتوں کے پیش نظر اس کی درجہ بندی کی ۔ پاکستان کی قومی زندگی کی عکاسی کرنے والے موضوعات جو شامل کتاب ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ۔

پاکستان کے صنعتی ، اقتصادی ، ترقیاتی اور تعلیمی منصوبے ، ۱۹۶۵ء کے ملکی انتخابات ، لاہور اور سیالکوٹ پر بھارتیوں کا حملہ ، پاکستان کی معاشرتی زندگی ، مذہبی تیوہار ، فنون لطیفہ ، شاعر ملت کا خراج تحسین ۔

یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ بارکر صاحب نے کس ژرف نگاہی سے پاکستانی اخبارات کا مطالعہ کیا اور کس دلچسپی سے اُنھوں نے اپنے اُردو شناسوں کے لیے موضوع انتخاب کیے ، ''فنون لطیفہ'' اور ''کل پاکستان کے مشاعرہ کراچی'' کے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں ۔ (سبق ۱۰)

''آج کل ہمارے ملک میں مصوروں کے تین گروہ کام کر رہے ہیں ۔ ان میں پہلا اور سب سے ممتاز گروہ ان مصوروں کا ہے جو روایتی مغل آرٹ کے ترجمان ہیں ۔ اس گروہ کے مصوروں نے نہ صرف مغل آرٹ کے آرائشی پہلوؤں پر زور دیا ہے بلکہ اس میں جدید فنی رجحانات کے تحت اپنی انفرادیت بھی پیدا کی ہے ۔ مصوروں کا دوسرا گروہ وہ ہے جس نے مقامی روایات اور حقیقت پسندی کو اپنا موضوع بنایا ہے ۔ تیسرا گروہ تجریدی اور تجرباتی فن کاروں کا ہے ۔ یورپ میں فن مصوری کے میدان میں گذشتہ پندرہ بیس سال میں جو تحریکیں شروع ہوئی ہیں ان کا سب سے زیادہ اثر اس تیسرے گروہ نے قبول کیا ہے ۔ اتنے گہرے مغربی اثرات کے باوجود ان کی تخلیقات میں روایتی جذباتیت کی نمایاں جھلک موجود ہے ۔''

کل پاکستان مشاعرہ کی رو داد کے سلسلے میں یہ اقتباس قابل ملاحظہ ہے ۔

''ہمارے ادب پر عہد حاضر کے سیاسی ، اقتصادی اور سماجی نظریات نے جو اثر ڈالا ہے وہ نئی نسل کے شعرا کے کلام سے بخوبی ظاہر ہے ۔ ان کے ہاں زندگی کے نئے تقاضوں کو سمجھنے اور اُنھیں پورا کرنے کا عزم

ہے ۔ ان کی شاعری میں گل و بلبل کے فرسودہ مضامین کے بجائے اب انسان کی معاشی مجبوریوں اور سماجی ناکامیوں کے ساتھ ساتھ اس کی جدوجہد کے بھی تذکرے ہیں ۔"

سبق ۱۰ کے اقتباس میں شاعر ملت علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اور ان کے فلسفۂ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

سبق ۱۳ میں مقامی خبروں کا عنوان قائم کیا گیا ہے ۔ اس کے تحت حضرت داتا گنج بخش کا عرس اور سپورٹس خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ سبق ۱۶ نئی کتابوں کے تبصروں پر مشتمل ہے ۔ سبق ۲۰ کا موضوع "معاہدہ تاشقند اور کشمیر" ہے ۔

پاکستانی موضوعات کے علاوہ بعض اقتباسات میں عالمی اہمیت کے موضوعات پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلاً سبق ۷ میں خلائی پروازیں ، سبق ۸ میں ویٹ نام اور انڈونیشیا ، سبق ۱۸ میں اسرائیل اور مشرق وسطی اور سبق ۱۹ میں سیاست اور عالمی امن کی رو داد پیش کی ہے ۔ لسانی اعتبار سے یہ کتاب بڑی اہم خصوصیات کی حامل ہے ۔ اُردو شناسی کے تقاضوں کے مطابق ہر سبق کے خاتمے پر بالالتزام الگ نئے سیکھے ہوئے الفاظ درج کیے ہیں اور ان کے بالمقابل یہی الفاظ رومن رسم الخط میں لکھے گئے ہیں ۔ تیسرے کالم میں ان کے معنی انگریزی میں بتائے گئے ہیں ۔ ہر سبق کی مشقیں متعدد صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ۔ ان میں سوال و جواب ، الفاظ کا مختلف جملوں میں استعمال ، الفاظ کے معنی ، الفاظ سے نامکمل جملوں کی خانہ پُری ، نیز اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا شامل ہیں ۔ یہ مشقیں نہایت ذہانت سے مرتب کی گئی ہیں جو قارئین کو سوچنے ، مفہوم کو سمجھنے اور الفاظ کو برمحل استعمال کرنے میں مدد دیتی ہیں ۔

خاتمۂ کتاب پر وہ تمام الفاظ حروف تہجی کے اعتبار سے درج کیے گئے ہیں جو اسی کتاب میں نئے الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں ۔ ہر لفظ کے سامنے سبق کا نمبر درج ہے تاکہ طلبہ کو ڈھونڈنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے ۔ ایسے الفاظ کی کل تعداد ۱۱۳۷ ہے ۔ یہ الفاظ پاکستان کی معیشت ، معاشرت ، صنعت ، تجارت ، فنون لطیفہ ، سپورٹس ، سیاست ، نظم و نسق ، تعلیم ، مذہب ، اقوام متحدہ ، مشرق وسطیٰ اور عالمی سیاست کے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مولف نے چونکہ ایک ممتحن کی حیثیت سے یہ اطمینان بھی کر لیا ہے کہ کتاب کے قارئین اُنھیں سمجھنے پر قادر ہیں اس لیے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے بارکر صاحب کی ابتدائی اُردو اور "اخباری زبان" کا غور سے

مطالعہ کیا ہے وہ زندگی کے ہر اہم موضوع پر کسی حد تک اظہار خیال کر سکیں گے ۔ نیز اُردو کے مضامین کو انگریزی میں منتقل کرنے پر بھی قادر ہوں گے ۔ یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''اخباری زبان'' اُردو لٹریچر میں قابل قدر اضافہ ہے ۔

''اخباری زبان'' ۳۰۲ صفحات پر مشتمل ہے کتابت اور طباعت نہایت دیدہ زیب ہے ۔''اخباری زبان'' کی تدوین میں مولف کو حسن جہانگیر ہمدانی صاحب اور شفیق الرحمٰن صاحب کا تعاون حاصل رہا ہے ۔ اس کا ناشر ادارہ اسلامیات میکگل یونیورسٹی ۔ مانٹریال کینیڈا ہے ۔ سال طباعت ۱۹۶۸ع ہے ۔ قیمت درج نہیں ۔ (مقبول بیگ بدخشانی)

دبستان غالب | مصنف: ناصر الدین ناصر ۔ ناشر: مکتبہ الفتح شارع علامہ اقبال لاہور ۔ تعداد صفحات ۲۳۱ ۔ سائز ۸ × ۶ انچ ۔ عمدہ طباعت ۔ قیمت: سادہ کاغذ ۱۵ روپے ، اعلیٰ کاغذ ۲۵ روپے ۔

فروری ۱۹۶۹ع میں مرزا غالب کی سو سالہ برسی کے موقع پر یہ کتاب پروفیسر سید علی صفدر جعفری کے پیش لفظ کے ساتھ لاہور سے شائع ہوئی ہے ۔ کتاب کی تدوین و ترتیب میں ایک خاص سلیقہ برتا گیا ہے اور مطالب کو دیکھ کر دل بلا تامل تصدیق کرتا ہے کہ اس کی ترتیب میں دس سال سے کم کیا لگے ہوں گے ۔ مصنف نے مقدمہ کتاب کے بعد جسے ''عرض مدعا'' کا نام دیا گیا ہے ،پہلے غالب کے حالات زندگی ، آثار اور اسلوب نگارش پر مبسوط مقالات قلمبندکیے ہیں اور پھر آٹھ عنوانوں (نقش فریادی ، اعجاز سخن ، کیفیت ، استغراق ادائے خاص ، تصویر نگاری ، شوخی تحریر ، سلاست بیان ، اور عقدہ ہائے مشکل) کے تحت غالب کے منتخب اردو اشعار کی سادہ و سلیس زبان میں شرح لکھی ہے ۔ آخر میں مقام غالب کے نام سے مضمون تو گویا اس کتاب کا نقطۂ عروج معلوم ہوتا ہے ۔

حالات و آثار والے مقالے میں غالب کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا اور ایک دانشور کے ''فرمودات'' کو سمجھنے کے لیے اس کی ''ذات'' کے متعلق جتنا کچھ جاننا ضروری ہوتا ہے ، وہ سب اس مضمون میں موجود ہے ۔ اس میں تاریخی پس منظر کے حسین خاکے کے بعد معلومات کو جس محنت و دقت سے فراہم کرکے لکھا گیا ہے اُس سے مصنف کے ایک معتبر و معتمد سوانح نگار ہونے کا پتا چلتا ہے ۔

تندرست اور اعلیٰ تنقید اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نقاد کو شاعر کے کلام

سے والہانہ لگاؤ ہو ۔ 'اسلوب نگارش' اور 'مقام غالب' کے عنوانوں پر مضامین میں مصنف نے کلام غالب سے اس والہانہ لگاؤ کا ثبوت دیا ہے ۔ یہ تنقیدی مقالے کلام غالب کو سمجھنے میں بجا طور پر قاری کی راہنمائی کرتے ہیں ۔

شرح والے حصے میں اشعار کو مختلف عنوانوں کے تحت تقسیم کرنا بالکل انوکھا انداز ہے ۔ ان عنوانوں سے اشعار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ۔ اس حصے میں ''عقدہ ہائے مشکل'' والا باب خاص طور پر اہم ہے جس کے تحت دو سو کے قریب مشکل اشعار کی شرح کرتے وقت بہت سے نئے نکتے پیدا کیے گئے ہیں ۔ دراصل یہ کتاب بیک وقت شرح حال بھی ہے اور شرح قال بھی ۔ تحقیق بھی ہے اور تنقید بھی ۔ ہر طرح کا قاری اس سے برابر کا فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔

اس کتاب میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن سے کتاب کی افادیت میں اگرچہ کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے ذرا کھٹکتی ہیں : مثلاً شروع میں مشروحہ اشعار کے مصرع ہائے اولی کی ایک ردیف وار فہرست ہے ۔ یہ فہرست مصرعوں کے حرف اول کے اعتبار سے الفبائی ترتیب سے ہوتی تو بہتر تھا یا پھر مصرع ہائے ثانی کی فہرست دی جاتی جن میں ردیف ہوتی ہے ۔ موجودہ صورت میں قاری کو شعر کے دونوں مصرعے یاد ہوں تو وہ شعر ڈھونڈ سکتا ہے جبکہ مجوزہ صورت میں صرف ایک یا آدھا مصرع بھی یاد ہو تو شعر مل جاتا ہے ۔ بعض املائی اغلاط بھی ہیں ؛ مثلاً ''خسرو دریا دل'' کو ''خسروئے دریا دل'' اور ''گذرنے ، گذرنا'' کو ہر جگہ ''گزرنے ، گزرنا'' لکھا ہے ۔ ایک جگہ ''سبد چین'' لکھا نظر پڑا جو دراصل ''سبد چین'' بغیر اضافت کے درست ہے ۔

(محمد بشیر حسین)

مجلس ترقی ادب کی کارگزاری

(۱)

'صحیفہ' کے بارے میں آرا

ماہنامہ کتاب لاہور جولائی و ستمبر ۱۹۶۹ع

اپنے معیار اور مواد کے لحاظ سے صحیفہ کا یہ غالب نمبر انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔

مجلس ترقی ادب نے "صحیفہ" کے غالب نمبر پر جتنی محنت کی ہے ، وہ حقیقتاً غالب کے سلسلے میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس کی ادارت کے ضمن میں واقعی بہت بڑی مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

صحیفہ کا غالب نمبر اس اعتبار سے بھی برعظیم کے تقریباً سبھی رسائل پر فوقیت حاصل کر گیا ہے کہ اس میں پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے ماہرین غالبیات کی نگارشات شامل ہیں اور سب کے سب مضامین تازہ ہیں ۔ غالب نمبر حصہ اول میں غالب کی شاعری ، نثر اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر ۳۲ مضامین کے علاوہ غالب کے چند منتخب اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے جو صوفی اے ۔ کیو ۔ نیاز اور زیتون عمر نے کیا ہے ۔

صحیفہ کا غالب نمبر فنی ، فکری اور تحقیقی اعتبار سے حقیقتاً ایک گراں مایہ دستاویز ہے ۔

نعیم زبیری ڈیڑھ ماہی "شگوفہ" مئی ۔ جون ۱۹۶۹ع ۔

صحیفے کے غالب نمبر کے اس حصہ اول کی سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ اس نے حصہ دوم کے شدید انتظار میں مبتلا کر دیا ہے ۔

افکار جشن غالب کی تقریبات کے سلسلے میں مجلس ترقی ادب لاہور کے سہ ماہی مجلہ "صحیفہ" نے غالب کی سوانح و شخصیت اور محاسن کلام کا دو خاص شماروں میں جائزہ پیش کیا ہے ۔ حصہ اول میں ۳۲ مقالات کے علاوہ زیتون عمر

اور صوفی اے ۔کیو ۔ نیاز صاحب کے غالب کے اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے ۔

قدر اول کے مضامین کے سلسلے میں قاضی عبدالودود ، مولانا غلام رسول مہر ، مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، اسلوب احمد انصاری ، عتیق صدیقی ، ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی ، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروق وغیرہ کے نام بلا تکلف پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ اکثر مضامین نہایت جامع اور فکر انگیز ہیں اور غالب پر کام کرنے والوں کی رہنمائی کریں گے ۔

حصہ دوم میں دس مضامین شامل ہیں ۔ ان مضامین میں غالب کو نئی جہت سے دیکھنے کا انداز جھلکتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار حضرات از سر نو غالب کو دریافت کرنے اور اس کی قدر نو (Revaluation) متعین کرنے کی سعی سعید کر رہے ہیں ۔ یہ ایک قابل قدر رجحان ہے ۔ دونوں شمارے صاف ستھرے ٹائپ میں اہتمام سے شائع ہوئے ہیں ۔

سال : ۲۵ شمارہ ۲۱٦

ماہنامہ زندگی جون ۱۹٦۹ء مجلس ترقی ادب لاہور کا سہ ماہی تحقیقی و علمی مجلہ ''صحیفہ'' پاک و ہند کے سنجیدہ اور ٹھوس مجلوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے ۔ اس نے جشن غالب کی تقریبات کے سلسلے میں اتنا ضخیم مجموعہ مرتب کیا کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا ۔ اس کا دوسرا حصہ اپریل میں شائع ہوگا ، عمدہ کاغذ اور اردو کے واضح ٹائپ میں زیر تبصرہ پہلا حصہ تقریباً ٥٠٠ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۲٦ مقالات ہیں ۔ کوئی مقالہ بھی سطحی اور بھرتی کا نہیں ہے ۔ ''صحیفہ'' ہند و پاک کے مشاہیر اہل قلم اور اہل علم و ادب کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے ۔ اس کا دوسرا حصہ بھی جب شائع ہو جائے گا تو دونوں حصوں کا مجموعہ غالب پر ایک چھوٹا موٹا انسائیکلوپیڈیا بن جائے گا اور غالب کو سمجھنے اور اس پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک تحفہ ہوگا ۔

ترجمان القرآن ماہ جولائی ۱۹٦۹ء

غالب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر پاک و ہند کے متعدد جرائد نے غالب نمبر شائع کیے ہیں ۔ زیر نظر نمبر بھی اسی سلسلے کی ایک قابل قدر کوشش ہے جسے اس کے فاضل مدیر نے بڑی کاوش اور دیدہ وری سے مرتب کیا ہے ۔ اس بزم غالب میں پاک و ہند کے قریب قریب سارے معروف لکھنے والے شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے غالب کی شخصیت اور اس کے فن کا نہایت

سلجھے ہوئے انداز میں جائزہ لیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کے لیے ستائش کے مستحق ہیں کہ انھوں نے غالب کے بارے میں نہایت قابل اعتماد علمی مواد جمع کر دیا ہے ۔ یوں تو اس نمبر کے سارے مقالات وقیع ہیں مگر چند ایک تو خاص طور پر قابل قدر ہیں ۔

شمس الرحمان فاروقی | ماہنامہ شب خون نمبر ۲۸ جولائی ۱۹٦۹ع

غالب پر تقریباً ہر پرچے نے کوئی نہ کوئی ضخیم یا مختصر نمبر شائع کیا ہے ، لیکن صحیفہ کا نمبر ، جو دو حصوں میں شائع ہوگا ، اور جس کا پہلا حصہ زیر نظر ہے ، غالباً ان سب سے بہتر ہے ۔ کیونکہ اس میں بیک وقت اعلیٰ ترین تنقید اور صحیح ترین تحقیق کے نمونے نظر آتے ہیں ۔

رشید حسن خان | ماہنامہ آجکل ماہ جولائی ۱۹٦۹ع ۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں مجلہ صحیفہ (لاہور) کے معیار و وقار میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے اور اس رسالے کا غالب نمبر اس کا تازہ ثبوت ہے ۔ اس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں اور دو حصے مزید شائع ہوں گے ، یعنی اس سال کے تین عام شمارے اور ایک ضخیم خاص شمارہ ، یہ سب غالب سے متعلق ہوں گے ۔ یہ بڑی ہمت اور جرأت کی بات ہے اور اس سے زیادہ اعتماد کی دلیل ہے ۔

غلام ربانی عزیز | ببلک سکول کیمبل پور یکم اگست ۱۹٦۹ع (خط)

غالب کی اس تقریب کے سلسلے میں جو علمی خدمت آپ نے سر انجام دی ہے ، وہ بلاشبہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور سزاوار صد آفرین و تحسین ہے ۔ جو غالب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے گی ۔

شجاعت علی قدرت نقوی ملتان | یکم اگست ۱۹٦۹ع (خط)۔

تیسرا شمارہ ملا ، بہر حال یہ شمارہ وقیع ہے کہ اس میں بعض مباحث نئے ہیں۔

المعارف | ستمبر ۱۹٦۹ع

مجلس ترقی ادب نے غالب کی صد سالہ برسی پر اپنے رسالے کے یہ دو غالب نمبر نکالے ہیں اور مزید دو نمبروں کا اس کی طرف سے اشتہار دیا گیا ہے جو جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوں گے ۔

حصہ اول میں ۲٦ مقالات ہیں جو پاکستان و ہندوستان کے مشہور اہل قلم کے ہیں ۔ ان مقالات میں جو اکثر خاصے طویل ہیں ، غالب کی ادبی خصوصیات

اور اس کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر خوب داد تحقیق دی گئی ہے ۔ ڈاکٹر عبد شمس الدین صدیقی کا مقالہ ''غالب کا زمانہ'' (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء) بڑا پر از معلومات ہے ۔ غالب کے ساتھ ان کے زمانے کے اخبارات نے کیا سلوک کیا ، اور وہ ان کا کس طرح ذکر کرتے تھے ؟ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنے مضمون ''غالب اور ان کی ہمعصر صحافت'' میں یہ دلچسپ معلومات بہم پہنچائی ہیں ۔ مختصات نثر غالب ، غالب اور ذال معجم ، مرزا غالب کا اسلوب نگارش (پنج آہنگ میں) ، قاطع القاطع ، کلام غالب میں تمثال شعری کا مقام اور ایسے ہی کئی اور مقالات خالص ادبی نوعیت کے ہیں اور ان پر خوب محنت کی گئی ہے ۔ ایک مقالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا 'محاسن خطوط غالب' پر ہے ۔ اسے پڑھ کر غالب کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔

صحیفہ کے غالب نمبر حصہ دوم میں دس مقالات ہیں ، پہلا مقالہ ہے ابن فرید کا ''غالب کی شاعری میں تسکین ضمیر'' یہ واقعی ایک انوکھا موضوع ہے اور مقالہ نگار نے غالب کی باطنی زندگی کے اس پہلو کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے ۔ موصوف کے نزدیک غالب پر ''میں'' چھائی ہوئی ہے اور ان کے الفاظ میں بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب اگر اپنی عملی زندگی میں اعتراف ذات کی طرف اس قدر متوجہ نہ ہوتے تو ان کے اشعار میں شاید اتنی گل کاریاں نہ ہوتیں اور وہ اپنے دور کے قدآور شاعروں میں زندہ و جولاں کلام کے ساتھ نمایاں نہ ہو سکتے ۔

ان کے علاوہ زیر نظر شمارہ کے دوسرے مقالات بھی قابل مطالعہ ہیں اور تحقیق سے لکھے ہیں ۔ صحیفہ کے یہ غالب نمبر غالبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں ۔

فرمان فتح پوری | کراچی ۵ اگست ۱۹۶۹ء

صحیفہ کا تیسرا غالب نمبر بھی مل گیا ۔ بہت خوب ہے ۔ آپ نے صحیفہ کے ذریعے بہت اہم اور قابل قدر مواد غالب کے سلسلے میں یک جا کر دیا ، نیز غالب کی روح آپ کی اس توجہ سے حد درجہ خوش ہوئی ہوگی ۔

(۲)

کتابوں کے بارے میں آراء

طبقات الشعرا | مجلس ترقی ادب نے کلاسیکی ادب کی اشاعت کا جوسلسلہ شروع کر رکھا ہے ، زیر نظر تذکرہ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے ۔

اُردو کے تحقیقی ادب میں نثار احمد فاروقی کی تحریریں جس خصوصیت کے سبب پہچانی جاتی ہیں ، اس کا واضح نشان طبقات کی ترتیب و تدوین میں بھی ملتا ہے ۔ زیر نظر تذکرہ جسے حصہ اول کی حیثیت حاصل ہے ، اصل متن کے علاوہ مرتب کے ایک تحقیقی مقدمہ پر مشتمل ہے ۔ اس مقدمے میں مرتب نے قدرت‌اللہ شوق کی زندگی ، تعلیم و تربیت ، ماحول ، ان کے تلامذہ و احباب ، تذکرے کے اہم ماخذ ، تذکرے کی اہمیت ، اس کے مخطوطوں کی نوعیت کے بعد دوسرے پہلوؤں پر طائرانہ بحث کر کے تذکرے کی افادیت کو دو چند کر دیا ہے ۔
(ماہنامہ نگار پاکستان کراچی مئی ۱۹۶۹) ۔

بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی ۱۷۵۷ تا ۱۸۵۷ع

مصنف عبداللہ ملک ۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، زیر نظر کتاب میں مصنف نے بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی کا جائزہ لیا ہے ۔ یہ جائزہ مصنف کی سیاسی بصیرت ، فکری صلاحیت ، تہذیبی اقدار سے لگاؤ ، مورخانہ سوجھ بوجھ اور ملت کے ثقافتی ورثے سے غیر معمولی محبت کا پتہ دیتا ہے ۔ ۱۷۵۷ع سے لے کر ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی تک بنگالی مسلمانوں نے پاک و ہند کی سیاسی بیداری اور ملی تحریکات میں کیا کردار ادا کیا ہے ؟ ان تحریکوں کے عواقب و عوامل کیا رہے ہیں ؟ کن بزرگوں کی قیادت میں یہ تحریکیں پروان چڑھی ہیں ؟ پاک و ہند کا سیاسی و ملی شعور خصوصاً اہل بنگال کے فکر و نظر کو ان تحریکوں نے کس طرح متاثر کیا ہے ۔ . . . . . اس قسم کے اور بہت سے سوالات اس کتاب میں اٹھائے گئے ہیں اور ہر سوال کا شافی جواب دیا گیا ہے ۔

کتاب کا بڑا وصف یہ ہے کہ مصنف کہیں بھی تعصبات و جذبات کا شکار نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنے ذاتی عقائد و نظریات کو ذرا دیر کے لیے الگ رکھ کر تاریخی شواہد کی روشنی میں واقعات کا جائزہ لیا ہے ۔ یہ جائزہ منطقی انداز استدلال اور فلسفیانہ طرز فکر کے ساتھ ایسا دل نشین پیرانہ بیان رکھتا ہے کہ کتاب کو ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔

(ماہنامہ نگار پاکستان
کراچی ماہ مئی ۱۹۶۹ع)

دیوان جہاندار میرزا جواں بخت جہاندار کا دیوان ہے جسے اردو کے ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر وحید قریشی نے مرتب کیا ہے ۔ کسی کلاسیکی کتاب کے

مخطوطے کا پڑھنا ، مختلف قلمی نسخوں سے اس کے متن کا مقابلہ کرنا اور کسی خاص عہد کے اسلوب تحریر ، استعمال لغات ، تذکیر و تانیث ، صرف و نحو اور املا کے اصول کو نظر میں رکھ کر اس کی تدوین و تصحیح کرنا خاصا مشکل کام ہے ۔ لیکن ''دیوان جہاندار'' کی ترتیب و تدوین پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ کام کرنے کی لگن ، حقائق کی تلاش ، نئی معلومات کی جستجو اور ادبی کاموں سے طبعی مناسبت ایسی چیزیں ہیں ، جو ایک مرتب و مدون کو ہر کٹھن منزل سے آسان گزار لے جاتی ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے مقدمے میں جہاندار کی زندگی ، شخصیت ، ماحول ، اس کے علمی و ادبی مشاغل و اس کی تصانیف ، اُردو کلام کے خطی نسخوں اور اس کی شاعرانہ قدر و قیمت ، سب کا خاطر خواہ جائزہ لیا ہے اور دیوان جہاندار کے مطالعے کو مفید سے مفید تر بنا دیا ہے ۔

ماہنامہ نگار پاکستان کراچی
ماہ مئی ۱۹۶۹ع

کلیات شیفتہ | مصنف : نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۔ مرتب : کلب علی خاں فائق ۔

شیفتہ کی اردو میں دو ممتاز حیثیتیں ہیں ۔ ایک تذکرہ نگار کی ، دوسرے شاعر کی ۔ دونوں حیثیتوں سے وہ اپنے عہد کی ثقافتی و شعری سرگرمیوں میں شریک مجلس نہیں بلکہ میر مجلس رہے ہیں ۔ شیفتہ نے اپنے ان معاصرین کے اثر کو قبول کیا ہے اور انھیں متاثر بھی کیا ہے ۔ اس اثر و تاثر کی کیا نوعیت ہے اور ہماری شعری و تنقیدی روایات کو کس طرح متاثر کیا ہے ۔ ان مسائل کو سمجھنے کے لیے شیفتہ کی زندگی اور ان کے کلام دونوں کا مطالعہ از بس ضروری ہے ۔ یہ دونوں چیزیں منتشر ہونے کے سبب ادب کے قارئین کی دسترس سے باہر تھیں ۔

اردو کے ممتاز محقق و ادیب کلب علی خاں فائق نے اس طرف خصوصی توجہ کی اور شیفتہ کے کلام و حیات دونوں کو طالبان ادب کے لیے آسان بنا دیا ۔ فائق صاحب نے کلیات کے متن کی صحت میں بھی عرق ریزی سے کام لیا ہے اور شیفتہ کی زندگی و ادبی شخصیت پر ایک مضبوط عالمانہ مقدمہ بھی سپرد قلم کیا ہے ۔

ماہنامہ نگار پاکستان کراچی
ماہ مئی ۱۹۶۹ع

آر - یو - آر | مصنف : کیریل چیپک (۱۸۹۰ء – ۱۹۳۸ء) مترجمین : بطرس بخاری مرحوم و سید امتیاز علی تاج -

آر - یو - آر ایک دلچسپ اور مفید ڈراما ہے اور طنز کا ایک مخصوص انداز رکھتا ہے - اسٹیج اور ڈراموں کی انجمنوں کے لیے جہاں اس کی حیثیت ایک سوغات کی ہے ، وہاں عام پڑھنے والوں کے لیے بھی یہ کھیل دلچسپی سے خالی نہیں ہے -

(ہمدانی نقوی)

سہ ماہی اردو ، شمارہ نمبر ۲ ، اپریل تا جون ۱۹۶۹ء)

یورپ میں تحقیقی مطالعے | تالیف : آغا افتخار حسین -

آغا افتخار حسین صاحب نے یہ اکیس مضامین جن پر زیر نظر کتاب مشتمل ہے ، اپنے یورپ کے قیام کے دوران لکھے - ان مضامین کے موضوعات تمام تر ادبی ہیں اور ان میں فاضل مصنف نے اُردو ادب کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو اب تک ہمارے ہاں اوجھل تھے -

(ماہنامہ المعارف ماہ جولائی ۱۹۶۹)

ماہنامہ **ادبِ لطیف** لاہور

محض ایک جریدہ نہیں ، ایک تحریک ہے

— کھوکھلا دعویٰ نہیں کرتا ، اٹل ثبوت پیش کرتا ہے -

— اس کا ہر شمارہ تازہ زندگی ، تازہ جد و جہد اور تازہ عزائم کے ساتھ فن اور ادب کی فضاؤں میں پھیل جاتا ہے -

مُدیر

ناصر زیدی

اُجلی کتابت ، آفسٹ کی بے داغ طباعت ، عمدہ سرورق

کسی اچھے بک سٹال سے طلب فرمائیے یا براہِ راست لکھیے

مینجر ماہنامہ ادبِ لطیف ، ۱۶ ، سرکلر روڈ - لاہور

سنگ میل پبلیکیشنز اُردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں

چند تازہ مطبوعات

☆ حقیقت روح انسانی : امام غزالی	۱/۵۰
☆ علم الکلام : امام غزالی	۳/۵۰
☆ ولی اللہ : مولانا محمد اسماعیل گودھروی	۱/۵۰
☆ جلیاں والہ باغ : ابو ہاشم ندوی	۱/۷۵
☆ باغ و بہار : میر امن دہلوی	۳/-
☆ سب رس کا تنقیدی جائزہ	۱/۵۰
☆ نقد سرشار : تبسم کاشمیری	۳/۷۵
☆ خیالستان : مقدمہ مبارزالدین	۳/-
☆ مثنوی سحرالبیان : مقدمہ احسان الحق اختر	۳/۵۰
☆ دہلی کا یادگار مشاعرہ : ،، ،، ،،	۳/۲۵
☆ رباعیات انیس : عمر فیضی	۱/۸۰
☆ انتخاب مومن : مشرف انصاری	۳/-
☆ پاکستان میں اُردو : طاہر فاروقی	۱۵/-
☆ خیابان اقبال : ،، ،،	۱۵/-
☆ تزک تیموری :	۲/۵۰
☆ تزک بابری : ترجمہ رشید اختر ندوی	۵/۵۰
☆ تزک جہانگیری : ترجمہ احمد علی رامپوری	۸/-
☆ ہمایوں نامہ : ترجمہ رشید اختر ندوی	۵/۵۰
☆ ابو ریحان البیرونی : لطیف ملک	۱۵/-

چند نئی مطبوعات

ڈاکٹر وحید قریشی کی تین نئی تصانیف

امراؤ جان ادا کا تنقیدی جائزہ

مرزا رسوا کا فن معاشرتی زندگی کے آئینے میں

باغ و بہار کا تنقیدی جائزہ

میر امن کے فن کو سمجھنے کے لیے ایک اہم دستاویز

قیمت : ۳ روپے

نقد جان

نظموں ، غزلوں اور دوہوں کا مجموعہ

قیمت : ۶ روپے

ملنے کا پتہ

سنگ میل پبلیکیشنز ، چوک اُردو بازار لاہور